آدابِ فتویٰ نویسی

فتویٰ نویسی کے رہنما اُصول وآداب، شامیہ کے تعارف
اوراُس کی کتابیات وشخصیات کے تذکرے کے ساتھ

تألیف
مفتی ابولبابہ شاہ منصور

ناشر
الفلاح پبلشر
0321-5728310

فہرست

آداب فتویٰ نویسی

نمبر شمار	مضامین	صفحہ

فہرست

برائے

فيض الغفار تعارف ردالمحتار

تلخیصی امانت

آپ کے ہاتھوں میں اس وقت اوراق کا جو مجموعہ ہے یہ قصداً نہیں اتفاقاً وجود میں آیا ہے اور اس میں جامع کا کچھ دخل نہیں، یہ دراصل ہمارے اکابر کی ولایت اور اسلاف سے سچی نسبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ زمانہ طالب علمی کے دوران تخصص کے سال میں بندہ نے افتاء سے متعلق اپنے اساتذہ کے ملفوظات محفوظ کر لیے تھے۔ پھر اکابر کے ارشادات اور ان کے املائی افادات کے خلاصے بھی جمع ہو کر ایک بیاض سی بن گئی تھی جو یادگار کے طور پر محفوظ رکھی تھی۔ پھر ہوا یوں کہ جب ''شرح العقود'' کے حاشیے کی تکمیل اور امام نووی رحمہ اللہ کے ''آداب الفتویٰ'' کے تحشیہ کا کام ہو رہا تھا تو کتب اصول فقہ و افتاء کی مراجعت کے دوران ایسی عبارات ملتی گئیں جو ہمارے اساتذہ و اکابر کے ملفوظات و ارشادات کی لفظ بہ لفظ مؤید تھیں یا پھر ان سے ان ہدایات کا استنباط ہوتا تھا جو یہ حضرات اپنے وجدان اور تجربے کی روشنی میں وقتاً فوقتاً دیا کرتے تھے لیکن ان کا ثبوت اسلاف کی کتب میں پایا جاتا ہے۔ ہمارے اساتذہ و اکابر کا اسلاف امت کے ساتھ یہ توافق دیکھ کر دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ ان یادداشتوں کی تخریج کی جائے تا کہ ان حضرات کی حقانیت اور ائمہ سلف سے سچی نسبت کی یادگار رہے۔ اس دوران جو نئی باتیں سامنے آتی گئیں انہیں بھی تتمیم فائدہ کے لیے ساتھ درج کر لیا گیا اور یوں یہ مجموعہ تیار ہو گیا، جو درحقیقت اکابر کے ملفوظات اور املائی افادات کی تلخیصی امانت ہے اور اہل علم کی خدمت میں محض دعا اور نصیحت و رہنمائی کے لیے پیش کی جا رہی ہے۔

آخر میں شامیہ کے متن، شروحات، تکملہ اور تقریرات کا تعارف بھی شامل کیا گیا ہے کہ ان سے عدم واقفیت تخصص کے طلبہ کو کافی عرصے تک خلجان میں مبتلا رکھتی ہے۔ شامیہ میں مذکور سو کتب فقہیہ اور سو فقہائے کرام کا مختصر تذکرہ بھی اس غرض سے دیا گیا ہے کہ متخصصین ان کا ایک بار مطالعہ کر کے مانوس ہو جائیں تو مطالعہ ومراجعت سہل اور دلچسپ ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے عاجزانہ دعا ہے کہ اس ''عجالہ'' کو افتاء کے میدان میں نو وارد مہمانانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نافع بنائے اور ان کی اس حقیر خدمت کو بندہ کے لیے اور تخصص کے ان طلبہ کے لئے جنہوں نے حوالہ جات کی تلاش کے دوران مراجعت میں ہاتھ بٹایا، ذریعہ نجات بنائے۔ آمین یارب العالمین!

الحمد للّٰہ و کفیٰ، والصلاۃ والسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

أما بعد:

دو تمہیدی باتیں:

❁ افتاء کی کامیاب تمرین کے لیے دو صفات ضروری ہیں:

۱- تیقظ و بیدار مغزی۔[1] فقاہت نفس اسی کا اعلیٰ درجہ ہے۔

۲- وسعتِ مطالعہ اور صحتِ استنباط۔[2]

اوّل سے نکتۃ الغور سمجھنا اور استفتاء کا تجزیہ و تحلیل کرنا آسان ہوتا ہے، دوسرے سے مراجعِ مسئلہ و مظانِ متوقعہ کی تعیین اور ان سے مسئلے کا استنباط سہل ہو جاتا ہے۔ ان دونوں صفات کے حصول کا طریقہ آگے اثنائے کلام میں آرہا ہے۔

❁ مسائلِ جدیدہ کے حل کے لیے دو چیزیں درکار ہیں: اجتہاد اور تدیّن۔ اجتہاد سے یہاں مراد یہ ہے کہ فقہاء کے اقوال کو واقعات پر صحیح طور پر منطبق کرنا آتا ہو اور یہ اجتہاد ختم نہیں ہوا، بلکہ قیامت تک باقی رہے گا اور تدیّن سے مراد یہ ہے کہ اغراض کا تابع نہ ہو کہ

۱- قال ابن الصلاح: "ویکون فقیه النفس، سلیم الذهن، رصین الفکر، صحیح التصرف والاستنباط، متیقظاً". (أدب المفتی والمستفتی: ۲۱)

۲- قال الإمام النووی: "هذه أصناف المفتین، وکل صنف منها یشترط فیه حفظ المذهب، وفقه النفس. فمن تصدی للفتیا ولیس بهذه الصفة، فقد باء بأمر عظیم". (المهذب شرح المجموع: ۱/ ٤٤)

کھینچ تان کرنا جائز کو حد جواز میں لائے۔[۱]

ان دو تمہیدی باتوں کے بعد اب آداب افتاء بالترتیب لکھے جاتے ہیں۔

جواب زبانی یا تحریری؟

جب کوئی مسئلہ پوچھے تو اس سے پہلے معلوم کرلیں کہ صرف زبانی پوچھنا چاہتا ہے یا اسے تحریری جواب بھی درکار ہے؟ اگر زبانی پوچھنا چاہتا ہے تو زبانی بتادیں، پھراس کولکھ کر نہ دیں۔ اگر تحریری جواب چاہتا ہے تو زبانی جواب نہ دیں، استفتاء وصول کر کے جواب کی تاریخ بتادیں۔ دونوں کام نہ کریں، اس میں کئی حکمتیں ہیں:

ایک یہ کہ اس سے آپ کا وقت ضائع اور آپ کی اہمیت کم ہوجاتی ہے، جبکہ مفتی کا وقت قیمتی ہے اور اسے اپنا وقار قائم رکھنا از حد ضروری ہے۔ جب لکھ کر دینا ہی ہے تو زبانی سوال سننے اور جواب بتانے میں اشتغال کا کیا فائدہ؟

دوسرے یہ کہ اگر زبانی جواب اس کے خلاف تھا تو اندیشہ ہے کہ وہ تحریری استفتاء میں سوال تبدیل کردے، تاکہ اپنی منشا کے مطابق جواب حاصل کیا جاسکے، کیونکہ اہل اغراض مسئلہ کا ایک رُخ دکھا کر اپنے حق میں فتویٰ حاصل کر لیتے ہیں، اگر دوسرا رُخ دیکھا جائے تو جواب کچھ اور ہوتا ہے۔

تیسرے یہ کہ ممکن ہے زبانی سوال میں کوئی اہم بات بیان کرنے سے رہ گئی ہو یا وہ آپ کے جواب کو پوری طرح سے سمجھا نہ ہو، جب تحریری جواب میں بدلی ہوئی صورتحال سامنے آئے گی تو بدنظمی اور بدظنی پیدا ہوگی۔

۱- قال الإمام السمعاني: "المفتي من العلماء من استكملت فيه ثلاث شرائط: أحدها:أن يكون من أهل الاجتهاد، وقدقدمنا شروط المجتهد وصفته. والشرط الثاني: أن يستكمل أوصاف العدالة في الدين حتى يثق بنفسه في التزام حقوقه وموثق به في القيام بشروط. والشرط الثالث: أن يكون ضابطا لنفسه من التسهيل كافاً لها عن الترخيص حتى يقوم بحق الله تعالى في إظهار دينه، ويقوم بحق مستفتيه". (قواطع الأدلة في الأصول: ۲/۸۳٤، وتحفة العلماء لحكيم الأمة التهانوي:۲/۲٦٤)

کونسا سوال وصول کیا جائے؟

صرف وہ سوال وصول کیا جائے جو صاف ستھرے اور بڑے کاغذ پر لکھا گیا ہو، کٹے پھٹے اور میلے کاغذ پر لکھا گیا سوال وصول ہی نہ کریں۔ اس کی دو وجوہ ہیں: ایک یہ کہ اس میں حکم الٰہی اور افتاء کی عظمت ہے۔ دنیوی دفتروں میں معمولی سے افسر کو بھی درخواست بڑے اور صاف کاغذ پر دی جاتی ہے۔ علمِ دین کی عظمت اس سے زیادہ احترام کی متقاضی ہے۔ دوسرے یہ کہ کاغذ جب بڑا ہوگا تو جواب اسی پر لکھا جائے گا، اس سے جعل سازی اور دھوکہ دہی کے امکانات ختم ہو جائیں گے اور سائل کے لیے یہ ممکن نہ رہے گا کہ وہ اپنی طرف سے سوال گھڑ کر آپ کے دیے گئے جواب کے ساتھ لگا دے۔[۱]

کون سے سوال کا جواب دیا جائے؟

سوال وصول کرتے وقت اسے غور سے پڑھ کر فیصلہ کریں کہ وہ جواب کے قابل ہے بھی یا نہیں؟ بہت سے سوال ایسے ہوتے ہیں جن کے جواب میں اشتغال مفتی کے لیے مناسب نہیں۔ ایسے مواقع میں حسنِ تدبیر سے کام لیتے ہوئے جواب سے معذرت کر لینی چاہیے۔ حدیث شریف میں آیا ہے: ''من حسن إسلام المرء ترکه مالا یعنیه''.

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے جو کئی مسائل میں توقف مروی ہے، مثلاً: اطفالِ مشرکین کے بارے میں فرمایا: ''اللّٰہ أعلم بما کانوا عاملین''. اس کی توجیہ کرتے ہوئے بعض محققین نے فرمایا ہے کہ درحقیقت امام صاحب رحمہ اللہ کا ان مسائل میں توقف سے مقصد ایسے امور کی تحقیق سے منع فرمانا تھا جن پر دین کے مقصدی امور موقوف نہیں، لہٰذا جن

۱- ینبغی إذا ضاق موضع الجواب أن لایکتبه فی رقعة أخری؛ خوفا من الحیلة، ولهذا قالوا: یصل جوابه بآخر سطر، ولایدع فرجة؛ لئلا یزید السائل شیئا یفسدها. (مقدمة المجموع: ۵۰)

کو ان کی ضرورت نہ ہو وہ ان کے درپے نہ ہوں، اس لیے انہوں نے سائل کو مجمل جواب دیا، اس کے سامنے تحقیق بیان نہیں فرمائی۔ امام صاحب نے اس اصل کو بہت سی فروع میں ملحوظ رکھا ہے کہ انہوں نے سوال کے غیر ضروری ہونے کی وجہ سے سائل کو واضح جواب نہیں دیا، بلکہ توقف کے عنوان سے سائل کو سوال لا طائل تحتہ سے روکنا چاہا۔

لہٰذا جب تک سائل کی غرضِ صحیح اور ضرورتِ واقعیہ متیقن نہ ہو جائے، جواب نہ دیا جائے۔ ضرورت کی تعریف یہ ہے: "اگر سائل کو جواب نہ ملے تو اس پر ضرر مرتب ہو"۔

جواب نہ دینے کی سات وجوہات:

ذیل میں وہ وجوہ بیان کی جاتی ہیں جن میں سے کسی ایک کا شبہ ہو تو (اطمینان کیے بغیر) جواب نہ دیا جائے:

۱- پہلی وجہ:

سائل کا مقصد کبھی کسی کی تضحیک، توہین، انتقام یا فتنہ انگیزی ہوتی ہے، ایسی صورت میں حکیمانہ اسلوب اختیار کرتے ہوئے معاملہ رفع دفع کر دینا چاہیے۔

۞ حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ نے ایک موقع پر نہایت قیمتی ہدایات بیان فرمائیں:

"آج کل یہ مرض ہے کہ ہر سوال کا جواب ہر سوال کرنے والے کو دے دیا جاتا ہے، حالانکہ ہر سوال کا جواب ہر سائل کے مناسب نہیں ہوتا، مثلاً: اگر کوئی شخص طبیب سے سنکھیا اور کُچلہ[1] کے مدبّر کرنے کی ترکیب پوچھے تو گو طبیب ناواقف نہیں، لیکن کیا ہر

۱- سنکھیا ایک قسم کا زہر ہے جسے سمّ الفار بھی کہتے ہیں۔ کچلہ ایک زہریلا پھل ہے۔ ان دونوں چیزوں کو مخصوص عمل سے گزارا جائے تو بجائے زہر کے دوا بن جاتے ہیں، اسی کو "مدبّر" کرنا یعنی قابل استعمال وانتفاع بنانا کہتے ہیں۔

کسی کو ترکیب بتا دینا مناسب ہے؟ اگر کسی طبیب کو کسی مریض پر اطمینان نہ ہو تو اس کو ہرگز وہ نسخہ نہ بتائے گا۔

اسی طرح مفتیانِ کرام کو چاہیے کہ یہ سمجھیں کہ کون سا سوال کس کے منصب کے موافق ہے؟ بعض غیر ضروری سوال ہوتے ہیں بعض غیر مناسب۔ اگر کوئی اصرار کرے تو کہہ دے کہ مجھے تحقیق نہیں اور اگر یہ کہتے ہوئے عار آئے تو کہہ دے کہ یہ سوال تمہارے منصب سے بالاتر ہے، بہت سے بہت وہ یہ سمجھے گا کہ انہیں کچھ آتا نہیں، تو اس سے تمہارا کیا نقصان ہے؟

بہت سے ایسے مسائل ہوتے ہیں جو عوام کے سمجھنے کے نہیں ہوتے، مثلاً: تقدیر کا مسئلہ یا تصوف کا کوئی باریک مسئلہ، مثلاً وحدۃُ الوجود۔ فرض کیجیے کوئی عامی شخص ایسا مسئلہ پوچھتا ہے، اس کو کیا جواب دیا جائے؟ یہی کہ بھائی! یہ تیری سمجھ سے باہر ہے۔ اگر اس کو جواب دیا گیا تو وہ گمراہ ہوگا۔

بعض نامناسب سوالات کا جو میں جواب نہیں دیتا تو میرے پاس دھمکی کے خطوط آتے ہیں کہ حدیث میں ہے:

”من سئل عن علم فكتمه، ألجمه الله بلجام النار يوم القيامة“.

یعنی اگر کسی سے علم کی بات پوچھی جائے اور وہ اس کو نہ بتلائے تو اس کو آگ کی لگام لگائی جائے گی۔ اس قدر بدتہذیبی پھیل گئی ہے کہ مسئلہ پوچھتے ہیں اور یہ حدیث لکھتے ہیں۔ ارے بھائی! جس سے مسئلہ پوچھا جائے کیا اس سے یہی معاملہ کیا جاتا ہے؟

کسی عالم سے کسی نے کوئی مسئلہ پوچھا، انہوں نے جواب نہیں دیا اور وہ کوئی ایسا ہی مسئلہ تھا۔ اس نے انہیں یہی حدیث سنائی۔ انہوں نے اس کو خوب جواب دیا: ”بہت اچھا! جب قیامت میں میرے لگام لگے اور میں آپ کو مدد کے لیے بلاؤں تو اس وقت مت آئیے گا، آپ بے فکر رہیں میں آپ کو تکلیف نہیں دوں گا“۔

اگر بلاضرورت ہی تحقیق کا شوق ہے تو مدارس میں جا کر ترتیب سے تعلیم حاصل کیجیے [۱]"۔

حکیم الامت حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ مزید فرماتے ہیں:

" ایک مرتبہ ایک شخص کا خط آیا کہ ایک واعظ صاحب فرماتے ہیں: " آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک کی زیارت ایک دفعہ تو واجب ہے اور دوسری دفعہ منع ہے "۔ یہ مسئلہ ٹھیک ہے یا نہیں؟

اسی طرح ایک شخص نے لکھا تھا کہ ایک واعظ صاحب یہ فرماتے ہیں: "جو عشاء کی سنتوں کو پڑھے وہ کافر ہے"۔ ایک ایسا ہی مضمون شہادت کربلا کے متعلق تھا۔ اس قسم کے مسائل میں غلط فہمی سے سائل کچھ کا کچھ سمجھ کر پوچھتا ہے اور اس بنا پر جواب حاصل کر کے فساد کا سبب بنتا ہے۔

اس قسم کے سوالات کے متعلق میرا معمول جواب دینے میں یہ ہے کہ لکھ دیتا ہوں:

''انہوں نے کچھ اور فرمایا ہوگا، عالم آدمی کبھی اس قسم کی بات نہیں کہہ سکتا، آپ نے غلطی سے کچھ اور خیال کر لیا ہے اور اگر واقعی یہ بات ہے تو ان کے ہاتھ سے لکھا کر بھیجئے''۔

فرمایا: ''پھر کوئی کچھ نہیں لکھتا۔ یہ طرز رفعِ فتنہ وانسدادِ فساد کے لیے بہت مستحسن ہے''۔

ایک واقعہ اور پیش آیا، جس شخص نے حضرت سے کوئی فتویٰ لیا تھا، اس نے اس پر مناظرانہ انداز سے اعتراضات لکھ کر بھیجے تھے، اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

" ہم نے اپنی معلومات کے مطابق جواب لکھ دیا ہے، اگر پسند نہیں ہے تو جس عالم پر اعتماد ہو اس سے رجوع کرو۔ (وفوق کل ذی علم علیم) "۔

۱- تحفۃ العلماء: ۲/ ۲۷۵، ۲۷۶

۞ ایک دفعہ مولانا(١) کے ایک تصحیح کردہ فتویٰ پر کہیں سے کچھ اعتراضات لکھے ہوئے آئے تھے، آپ نے اس کا جواب لکھنا چاہا، مولانا نے فرمایا: "اس کا جواب مت لکھنا! صرف یہ لکھ دو کہ اس کا جواب تو ہے، مگر ہم مرغانِ جنگی نہیں ہیں کہ سوال و جواب کا سلسلہ دراز کریں، بس اس جواب کا حق ایک دفعہ ادا ہوگیا تھا اور یہ لکھ دو کہ اگر اطمینان نہ ہو تو "فوق کل ذی علم علیم" دوسری جگہ دریافت کرلو، جنگ وجدل سے معاف کرو"۔

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ فرمایا کرتے تھے کہ مولانا کی بات اس وقت تو سمجھ میں نہیں آئی تھی، مگر اب اس کی قدر معلوم ہوتی ہے۔ جنگ وجدل کرنا اس کا کام ہے جس کو فرصت ہو اور بیکار ہو۔ اس کی مثال ایک حکایت ہے: "ایک شخص کی ڈاڑھی میں سفید بال تھے، جب حجام کے سامنے خط بنانے بیٹھا تو کہنے لگا: سفید بال سارے چن لو۔ نائی نے ساری ڈاڑھی صاف کردی اور کہا کہ تم خود چن لو، مجھ کو فرصت نہیں"۔ کام کا آدمی بکھیڑوں سے اس طرح گھبراتا ہے۔ ہاں شرعی ضرورت ہو تو اور بات ہے، جو سمجھنا چاہے اس کو سمجھا سکتے ہیں لیکن اعتراض کا تو کوئی جواب نہیں(٢)۔

۞ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس سوال آیا کہ ہماری مسجد کے امام صاحب فلاں فلاں آداب کا خیال نہیں رکھتے، آیا انہیں ایسا کرنا چاہیے یا نہیں؟ سوال کسی مقتدی کی طرف سے تھا اور اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ اس استفتاء کا مقصد امام

١- غالباً اس سے حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی صاحب قدس سرہ مراد ہیں جو فتویٰ میں حضرت تھانوی کے استاذ اور حضرت مولانا مملوک علی صاحب کے شاگرد تھے۔ حضرت مولانا مملوک علی صاحب فن افتاء میں حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کے اور وہ شاہ عبدالعزیز صاحب کے شاگرد تھے۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

٢- دیکھیے: تحفۃ العلماء: ٢/ ٢٨٢، ٢٨٣

صاحب کو حق کی دعوت دینا یا صحیح بات کی طرف توجہ دلانا نہیں، بلکہ ان کی تحقیر اور بعض خلاف احتیاط امور کی تشہیر ہے، چنانچہ آپ نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

"یہ سوال خود امام کے پوچھنے کے ہیں، ان سے کہیے کہ وہ تحریراً یا زبانی معلوم فرمالیں"۔

ایک صاحب نے ایک مشہور شخصیت کے بارے میں کچھ باتیں لکھ کر سوال کیا: "کیا وہ ان امور کی وجہ سے فاسق ہوگئے؟" آپ نے فرمایا: "مجھے ابھی تک اپنے فسق کی طرف سے اطمینان نہیں ہوا، میں کسی دوسرے کے بارے میں کیا فیصلہ کروں؟"

ایک مرتبہ کسی نے پوچھا: "یزید کی مغفرت ہوگی یا نہیں؟" آپ نے جواب دیا: "یزید کی مغفرت سے پہلے اپنی مغفرت کی فکر کرنی چاہیے"۔(۱)

(۲) دوسری وجہ:

کبھی مبتدعین یا دوسرے فرقے (خصوصاً غیر مقلدین اور منکرین حدیث) یا مفتن افراد طویل سوالات بھیج کر علماء کو کام سے ہٹا کر لایعنی میں مشغول کرنے یا دِق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی اغراض فاسدہ کو نامراد بناتے ہوئے حسب موقع معذرت یا تنبیہ کرنی چاہیے۔ ان کو جواب نہ دینا کتمانِ حق کی وعید میں داخل نہیں، کتمانِ حق وہاں ممنوع ہے جہاں سائل طالب ہو اور اسے جواب نہ ملنے سے ضرر ہو، یہاں تو جواب دینے میں ضرر ہے۔(۲)

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے ایسے موقع پر دلچسپ واقعات منقول ہیں:(۳)

۱- البلاغ، مفتی اعظم نمبر ۱/ ۳۸۵، ۳۸۶

۲- قال الإمام الشاطبی فی بیان المواضع التی یکره فیها السؤال: "العاشر: سؤال التعنت والإفحام، وطلب الغلبة فی الخصام، وفی القرآن فی ذم نحو هذا: ﴿ومن الناس من یعجبك قوله فی الحیاة الدنیا، ویشهد الله علی ما فی قلبه وهو ألد الخصام﴾ وقال: ﴿بل هم قوم خصمون﴾ وفی الحدیث: "أبغض الرجال إلی الله الألد الخصم". (الموافقات: ٤/ ٦٦٤)

۳- دیکھئے: تحفۃ العلماء: ۲/ ۳۰۱-۳۱٤

۞ فرمایا: "ایک شخص کا خط آیا۔ اس میں لکھا ہے ایک شخص کی بیوی کا انتقال ہوگیا ہے اس نے بیس دن کے بعد اپنی سالی سے نکاح کرلیا ہے۔ یہ نکاح درست ہے یا نہیں؟ اور شامی میں جو مردوں کے واسطے بیس عدتیں لکھی ہیں اس کا کیا مطلب ہے؟ میں نے لکھا: "نکاح تو ہوگیا، شامی میں جو لکھا ہے وہ خود دیکھ لو مجھ سے کیوں دریافت کرتے ہو؟"

۞ فرمایا:" لوگوں کے دماغ خراب ہوگئے ہیں، ایک صاحب نے کچھ مسائل دریافت کیے ہیں، لکھا ہے کہ ان کا جواب حدیث سے تحریر فرمایا جائے، میں نے لکھ دیا ہے: "فقہ میں تو اس کا جواب یاد ہے حدیث میں نہیں، اس لیے معذور ہوں"۔

۞ ایک شخص نے اصحاب کہف کے نام خط میں پوچھے، آپ نے لکھا:"اصحاب کہف کے اعمال پوچھو، تم ہی اصحاب کہف کی طرح ہو جاؤ گے"۔

۞ ایک شخص نے خط میں سوال کیا کہ بیس رکعت تراویح کا کیا ثبوت ہے؟ اس کا جواب تحریر فرمایا:"کیا مجتہدین پر اعتبار نہیں؟"

یہ جواب لکھنے کے بعد فرمایا:"اگر اس شخص نے یہ لکھا کہ " مجتہدین پر اعتبار نہیں" تو یہ لکھوں گا کہ " مجھ پر کیسے اعتبار کرلیا، جب کہ امام ابوحنیفہ جیسے حضرات پر اعتماد نہیں کیا؟"

۞ ایک شخص نے مسئلہ پوچھا کہ میں نے عورت کو لفظ طلاق نہیں کہا بلکہ "تلاک" کہا۔ فرمایا: " نکاح کے وقت بھی نکاح نہ کہا تھا "نکاہ" کہا تھا، اگر اس سے نکاح نہ ہوا تھا تو عورت سے نکاح نہ ہونے کے سبب جدا ہونا چاہیے"۔

۞ ایک صاحب کا خط آیا ''جناب آپ خط کے ذریعے لوگوں کو مرید کرتے ہیں، اس کی کیا دلیل ہے اور یہ سنت سے ثابت ہے یا نہیں؟ آپ نے جواب میں لکھا:"یہ میرا فعل ہے، آپ میرے فعل کی دلیل کیوں دریافت کرتے ہیں، آپ کو کیا حق ہے؟ آپ بلا دلیل کسی کو مرید نہ کریں"۔

(۳) تیسری وجہ:

کبھی سائل اپنی حماقت کی وجہ سے فضول سوالات کرتا ہے، جن کا اس کے عقیدے یا عمل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، ایسے سوالات کے جواب میں اشتغال کم فہمی کی نشانی ہے۔(۱)

ذیل میں حضرت تھانوی قدس سرہ سے منقول چند واقعات نقل کیے جاتے ہیں جن میں مفتی کے لیے مثالی طرز عمل اور لائق تقلید نمونہ ہے:

۞ ایک شخص نے سوال کیا کہ ایک عورت جارہی تھی، اس کے ساتھ اس کا شوہر اور اس کا بھائی بھی تھا، راستہ میں کسی رہزن نے ان دونوں کو قتل کر دیا، اتفاقاً اس طرف سے ایک فقیر کا گذر ہوا، عورت کی التجا سے فقیر نے کہا کہ ان دونوں کا سر دھڑ میں ملا کر رکھ دے، میں دعا کروں گا۔ عورت نے غلطی سے بھائی کا سر شوہر کے دھڑ میں اور شوہر کا سر بھائی کے دھڑ میں جوڑ دیا، فقیر نے دعا کی تو دونوں زندہ ہوگئے۔ اس میں عورت کس کو ملے گی؟

حضرت فرماتے ہیں: ”میں نے اس کا جواب نہیں دیا اور سوال کرنے والے کو زجر وتوبیخ کی، کیونکہ ایسے سوال بالکل لغو اور بے ہودہ ہیں، ایسے سوال کا کوئی جواب نہ دینا چاہیے، لوگوں کو چاہیے کہ اپنے کام کی بات دریافت کریں، ایسے فضول سوالات سے تضییع اوقات نہ کیا کریں“۔

۞ کسی نے لکھا حضرت آدم علیہ السلام کا انتقال پہلے ہوا یا حضرت حوّا کا؟ اور ان دونوں کے بیچ میں کس قدر زمانہ گذرا ہے؟ آپ نے اس کا جواب دیا: ”میں نے کہیں نہیں دیکھا“۔

۱- قال العلّامة ابن عابدين الشامي: "يكره الجدال في أن لقمان وذالقرنين وذالكفل أنبياء أم لا؟ وينبغي أن لايسأل الإنسان عمالاحاجة إليه، كأن يقول: كيف هبط جبريل؟ وعلى أيّ صورة رآه النبي صلى الله عليه وسلم؟ وحين رآه على صورة البشر هل بقي ملكا أم لا؟ وأين الجنة والنار؟ ومتى الساعة ونزول عيسى؟ وإسماعيل أفضل أم إسحق وأيهما الذبيح؟ وفاطمة أفضل من عائشة أم لا؟ وأبوا النبي صلى الله عليه وسلم- كانا على أيّ دين؟ وما دين أبي طالب؟ ومن المهدي؟ إلى غير ذلك مما لاتجب معرفته، ولم يرد التكليف به". (رد المحتار على الدر المختار: ٧٥٤/٦)

۞ ایک خط میں آیا تھا کہ معلوم ہوا ہے بھوک کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شکم مبارک پر پتھر باندھا ہے، کتب سیَر کے حوالے بھی دیے ہیں، پوچھا تھا کیا یہ صحیح ہے؟ آپ نے لکھا: "اگر صحیح ہے تو تم کیا کرو گے؟" مطلب یہ کہ غیر ضروری تحقیق سے کیا فائدہ؟

۞ ایک شخص نے سوال کیا: "حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین شریفین کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟" آپ نے اس سائل سے دریافت کیا: "تم سے موت کے وقت یا قبر میں یا حشر میں یا میزان پر یہ سوال ہوگا؟" عرض کیا: نہیں۔ پھر کہا: "کیا تم کو معلوم ہے کہ روز قیامت نماز کی پوچھ ہوگی؟" عرض کیا کہ جی معلوم ہے۔ کہا: "اچھا بتلاؤ نماز میں فرائض، واجبات، سنن، مستحبات کیا کیا ہیں؟" بے چارہ گم صم ہوگیا۔ فرمایا: "جاؤ! کام کی باتوں میں وقت صرف کیا کرتے ہیں، غیر ضروری سوال نہ کرنا چاہیے"۔

۞ ایک مرتبہ آپ کے پاس ایک سوال آیا کہ عوج بن عنق[1] اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کا عصا کتنے لمبے تھے؟ آپ نے جواب لکھا: "جیسا یہ سوال غیر ضروری ہے، اسی طرح جواب کی بھی ضرورت نہیں"۔

۞ فرمایا: "بعض لوگ مجھ سے سوال کرتے ہیں: کوّا حلال ہے یا حرام؟" میں ان سے پوچھتا ہوں: کیا اس کے کھانے کا ارادہ ہے؟ وہ کہتے ہیں: "بھلا اس کو کیوں کھانے لگیں؟" میں نے کہا: "جب ارادہ کھانے کا نہیں تو پھر کیوں پوچھتے ہو؟" کیونکہ یہ فروعی مسائل میں سے ہے، اصول وعقائد میں سے نہیں کہ قیامت میں پوچھ ہو کہ کیا اعتقاد رکھا تھا؟

۱- بنی اسرائیل نے "جبارین" سے لڑنے کا عذر بیان کرنے کے لیے جو روایات گھڑی ہیں، ان میں سے ایک من گھڑت روایت یہ ہے کہ ان "جبارین" میں ایک شخص عوج بن عنق تھا، جس کا قد تین ہزار ذراع تھا۔ اس کے علاوہ اس کے بارے میں مزید افسانہ طرازیاں بھی ہیں، جن کو محققین نے اساطیر میں سے قرار دے کر سختی سے تردید کی ہے۔ دیکھیے: تفسیر ابن کثیر میں آیت کریمہ ﴿إن فیھا قوماً جبارین﴾: ۴۱/۲

غرض میری یہ تھی کہ عوام الناس کو علماء پر جرأت نہ ہو، اور فضول میں مشغول نہ ہوں"۔

۞ ایک شخص نے سوال کیا: تصویر کا رکھنا گناہ صغیرہ ہے یا کبیرہ؟

آپ نے جواب لکھا: "کپڑوں کے بکس میں آگ رکھتے ہوئے بھی تحقیق کی ہے کہ چھوٹی چنگاری ہے یا بڑا انگارہ؟"

۞ ایک صاحب نے سوال کیا کہ حضرت! کشمیر کے متعلق اکثر لوگوں کو مالی وجانی امداد کرنے میں اشکال ہے، شرعی حکم کیا ہے؟ اس سائل کا قصد خود عمل کا نہ تھا ویسے ہی مشغلہ کے طور پر پوچھا تھا، اس لیے فرمایا: "جس شخص کا امداد کرنے کا ارادہ ہو اس کو خود سوال کرنا چاہیے۔ اگر آپ ہی کا ارادہ ہے تو ظاہر کیجیے کون سی امداد کرنا چاہتے ہیں تا کہ اس کا حکم ظاہر کروں"۔ عرض کیا بعض لوگ دریافت کرتے ہیں۔ فرمایا: " سوال اسی شخص کو کرنا چاہیے جس کا کچھ کرنے کا ارادہ ہو، دوسروں کو جواب دینے کی آپ کو کیا فکر؟ کہہ دیجیے: "ہم کو نہیں معلوم"۔ دوسری بات یہ ہے کہ جواب تو جب ہی ہوسکتا ہے جب سوال کی صورت متعین ہو، وہاں کے واقعات کی تنقیح جب تک نہ کی جائے جواب کس بات کا ہو؟ اس کے متعلق یہاں پر بہت سارے سوالات آتے ہیں، میں لکھ دیتا ہوں: "زبانی سمجھنے کی بات ہے، زبانی آ کر سمجھ لو"۔ یہ اسی واسطے کہ سائل سے واقعات کی تنقیح کرلی جائے۔

۞ فرمایا: ایک خط آیا ہے کہ ایک شخص ضد کر رہا ہے مجھ کو بقرعید کے دن قربانی میں ذبح کر ڈالو ورنہ میں کنویں میں کود کر مرجاؤں گا تو اس میں کیا مسئلہ ہے؟ میں نے لکھ دیا: "اگر ایسا کیا تو دونوں جہنم میں جاؤ گے اور اگر وہ کنویں میں کود گیا تو وہ جہنمی ہوگا"۔

۞ ایک خط میں کسی نے لکھا: " ارواحِ انبیاء واولیاء دردنیا آیند یا نہ؟" میں نے لکھ دیا ہے: "بدین مسائل چہ حاجت در دین؟" اور اگر تصحیح عقائد کی غرض ہو تو ایسے امور میں " اللہ أعلم" کا عقیدہ کافی ہے، کیونکہ ایسے امور غیر مقصود ہیں۔

۞ فرمایا: "ایک ہیڈ ماسٹر صاحب کا خط آیا جس میں درود شریف اور قراءت خلف الامام پر کچھ شبہ ظاہر کیا ہے، مگر اس شخص کو لیاقت نہیں، کچھ نہیں سمجھے گا، میں نے لکھ دیا ہے: "پہلے مبادی سیکھ لو تب جواب لکھوں گا ورنہ نہیں"۔ اسی طرح ایک اور انجینئر صاحب تھے، وہ ان مبادی کے سیکھنے کے بارے میں فرمانے لگے: "اب ہم پھر بچوں کے ساتھ الف با پڑھیں؟" میں نے کہا: "اگر نہ پڑھو تو مقلد بنو، محقق بننے کا ارادہ نہ کرو"۔

۞ ایک مرتبہ فرمایا: "ایک صاحب نے عجیب بے ہودہ سوال کیا ہے، لکھتے ہیں: "میرے لیے میری اصلاح بہتر ہے یا میرے اہل وعیال کی؟" میں نے لکھ دیا: "کلیات لکھ کر سوال کرنا اصول کے خلاف ہے، جزئیات ظاہر کر کے اپنی پوری حالت لکھو اور پھر رائے معلوم کرو"۔

۞ مجھ سے ایک دفعہ پوچھا گیا: سود کیوں حرام ہے؟ میں نے کہا: "اس واسطے کہ حق تعالیٰ نے اس کو حرام کر دیا ہے"۔ کہا: "حق تعالیٰ نے کیوں حرام کیا؟" میں نے کہا میں اس وقت مشورے میں شریک نہ تھا جو وجہ پوچھ لیتا، اور اگر شریک ہوتا تب بھی یہی کہتا جو آپ لوگ حکام دنیا کے مشوروں میں رات دن کہا کرتے ہیں: "جو ہجور [حضور] کی رائے ہو" یا شاید یہ بھی کہہ دیتا کہ مسلمانوں پر ایک وقت افلاس کا آنے والا ہے، لہٰذا اس کو حرام نہ کیجیے، مگر مجھ سے کسی نے پوچھا ہی نہیں۔ اب وہ صاحب کہنے لگے کہ حکم خداوندی تو حکمت سے خالی ہوگا نہیں، وہ حکمت معلوم ہونا چاہیے۔ میں نے کہا: "حکمت ضرور ہے مگر میں بیان سے معذور ہوں، کیونکہ آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی"۔ کہنے لگے: "بیان تو کیجیے، میری سمجھ میں آئے نہ آئے۔" میں نے کہا: "میرے پاس ایسا فالتو دماغ نہیں ہے، ہاں! اس کی ایک صورت یہ ہے کہ کسی سمجھدار طالب علم کو میرے پاس لے آؤ، جو کم از کم ہدایہ پڑھتا ہو، وہ مجھ سے یہ سوال کرے تو میں اس کو حکمت بتا دوں گا، آپ بھی سن لیں، اس صورت میں میرا وقت تو بے کار ضائع نہیں ہوگا، کیونکہ صحیح مخاطب سامنے ہوگا، اس وقت آپ کو بھی معلوم ہو جائے گا کہ آپ ان حکمتوں کے سمجھنے کے قابل نہیں ہیں"۔

افسوس! آج کل تو پوچھنے والوں کی یہ حالت ہے کہ اس غرض سے مسئلہ پوچھتے ہیں

کہ ہمارے خیال کے موافق اس مسئلہ کا جواب دیا جائے اور جو لوگ اپنے آپ کو تعلیم یافتہ اور ریفارمر [مصلح] سمجھتے ہیں وہ تو پوچھتے ہی نہیں، بلکہ خود بے دھڑک تحریف کرتے ہیں، گویا دین ان کے گھر کا قانون ہے، جو چاہا بنا دیا۔

ایک وکیل نے پوچھا نمازیں پانچ کیوں مقرر ہوئیں؟ میں نے کہا: "تمہاری ناک منہ پر کیوں ہے، پشت پر کیوں نہیں؟" اس نے جواب دیا: اگر پشت پر ہوتی تو بدصورت معلوم ہوتی۔ میں نے کہا: "بالکل غلط ہے، اگر سب کی ناک پشت ہی پر ہوا کرتی تو ہرگز بری نہ لگتی"۔ بس چپ رہ گیا۔

ایک شخص نے دریافت کیا تھا: "اجنبیہ عورت کا بوسہ لینے سے روزہ فاسد ہوتا ہے یا نہیں؟" میں نے جواب دیا: "یہ کیوں نہیں دریافت کیا کہ گناہ بھی ہوتا ہے یا نہیں؟" آج پھر خط آیا ہے کہ یہ تو مجھ کو معلوم تھا اس میں گناہ ہے۔ میں نے آج جواب لکھا ہے: "جب روزہ میں معاصی صادر ہوں تو وہ مقبول ہی نہیں ہوتا، پھر اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے"۔

اگر میں ضابطہ کا جواب دیتا ہوں کہ فاسد نہیں ہوتا تو دلیری پیدا ہوتی ہے، اگر لکھتا ہوں کہ فاسد ہو جاتا ہے تو غلط ہوتا ہے، اس لیے میں نے ایسا جواب لکھا ہے جس سے نہ فتویٰ غلط ہو نہ دلیری بڑھے۔[1]

(٤) چوتھی وجہ:

کبھی سائل کا مقصود مفتی کا امتحان لینا ہوتا ہے، کوئی ایسی جرأت کرے تو اس کے دماغ کی درستگی کا اہتمام کرنا چاہیے۔[2]

۱- ماخوذ از تحفۃ العلماء: ۲/۲۸٤

۲- قال الإمام الشاطبی فی بیان المواضع التی یکرہ فیها السؤال: "الرابع: أن یسأل عن صعاب المسائل وشرارها، کما جاء فی النهی عن الأغلوطات".

(الموافقات: ٤/٦٦٣)

۞ حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے ایک مرتبہ فرمایا: ''آج کل یہ حالت ہے کہ لوگ ضروری باتیں تو دریافت کرتے نہیں، وہ مسائل پوچھتے ہیں جن سے کبھی واسطہ نہ پڑے، یا وہ مسائل پوچھتے ہیں جو پہلے سے معلوم ہیں تاکہ مولوی صاحب کا امتحان ہوسکے۔

چنانچہ رام پور میں ایک صاحب نے مجھ سے اختلافی مسائل پوچھے جن میں میرا مسلک ان کو معلوم بھی تھا۔ میں سمجھ گیا اس سوال سے میرا امتحان مقصود ہے، میں نے کہا: ''آپ امتحان کے لیے پوچھتے ہیں یا عمل کے لیے؟ اگر عمل کے لیے پوچھتے ہیں تو اس کے لیے مسئول سے اعتقاد ہونا شرط ہے اور آپ مجھے جانتے بھی نہیں تو میرے معتقد کیسے بنے؟ اور محض نام سننا کافی نہیں، نام تو نامعلوم کتنوں کا سنا ہوگا؟ اور اگر امتحان کے لیے پوچھتے ہیں تو آپ کو میرے امتحان کا کیا حق ہے؟''

بس وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ میں ایسا روگ نہیں پالتا کہ ہر شخص کا اس کی مرضی کے مطابق جواب دیا کروں''۔

(۵) پانچویں وجہ:

کبھی سائل کو اصل جواب دینے کی بجائے ''جواب علی اسلوب الحکیم'' دیا جاتا ہے۔ مفتی کو اس کی بھی مشق ہونی چاہیے۔

۞ حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک شخص مع اپنے کنبے کے لایا گیا، وہ خانساماں تھا، اس نے انگریز کی بچی ہوئی چائے پی لی تھی۔ اس کے تمام متعلقین نے اس سے نفرت ظاہر کی کہ تو ''کرسٹان'' [کرسچن، عیسائی] ہوگیا۔ یہ شخص بہت پریشان تھا۔ حضرت شاہ صاحب کے پاس سب مسئلہ پوچھنے آئے۔ شاہ صاحب کے پاس اہل علم کا مجمع رہتا تھا۔ شاہ صاحب نے فرمایا: ''اتنی بڑی بات اتنی جلدی طے نہیں ہوسکتی، کل آنا کسی بڑی کتاب میں مسئلہ دیکھیں گے'' اور بیوی بچوں سے کہا: اس سے الگ رہنا! کئی روز دق کر کے فرمایا: ''آج ایک روایت نکلی ہے، بہت بڑی بات ہوگئی تم سے، اتنے مساکین کو کھانا کھلاؤ!

اتنی نفلیں پڑھو! غسل کرو!" غرض بڑا بکھیڑا بتلایا۔ شاگردوں نے جرحاً باہم کہا: نہ معلوم شاہ صاحب نے یہ مسئلہ کہاں سے فرمایا؟ حضرت شاہ صاحب نے سن کر فرمایا: "تم کیا جانو؟ یہ انتظامی بات ہے، ایسا نہ ہوتا تو لوگ دلیر ہو جاتے اور کرسٹان بننا شروع ہو جاتے"۔

۞ ایک شخص نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا: حضرت! میں نے چماروں کے کنویں سے پانی لیا ہے۔ فرمایا: "توبہ کرلو اور آئندہ ایسا مت کرنا"۔ جب وہ شخص چلا گیا تو فرمایا: "یہ میں نے اس لیے کہا تاکہ دل میں رکاوٹ رہے اور آگے نہ بڑھے، نفرت پیدا ہو"۔

۞ ایک اور صاحب نے حضرت سے استفسار کیا کہ میرے لیے ملازمت سرکاری کے علاوہ اور کوئی صورت معاش کی نہیں اور سرکاری ملازمت بغیر ڈاکٹری معائنہ کے ہو نہیں سکتی اور ڈاکٹری معائنہ میں بالکل برہنہ ہونا پڑتا ہے اور میں منتخب ہو چکا ہوں صرف ڈاکٹری معائنہ کی رکاوٹ باقی ہے تو کیا اس مجبوری میں ڈاکٹری معائنہ جائز ہے یا نہیں؟

حضرت نے جواب تحریر فرمایا: "جائز سمجھنے سے زیادہ بہتر ہے کہ ناجائز سمجھا جائے اور کرالیا جائے، اس کے بعد توبہ کرلی جائے"۔

پھر فرمایا: "ایسے جواب کی یہ بھی وجہ ہے کہ اب کیا معلوم واقعی اس کے سوا اور تمام ذرائع آمدنی کے ان کے لیے مفقود ہیں یا نہیں؟ کیونکہ گھاس تو کھود سکتے ہیں، کسی مسجد میں مؤذنی تو کر سکتے ہیں، البتہ تنعّم چاہتے ہوں تو دوسری بات ہے، پھر ضرورت کے تحقق پر بھی اگر میں یہ لکھ دیتا ہوں کہ جائز ہے تو جرأت بڑھ جاتی، نہ معلوم کہاں تک نوبت پہنچتی۔ میرے اس جواب میں اہل علم کے لیے بڑا سبق ہے کہ وہ ایسے خیالات کی رعایت رکھا کریں"۔[۱]

(٦) چھٹی وجہ:

اگر سوال کسی عالمِ دین یا کسی دینی ادارے کے بارے میں ہو، یا اس میں کسی فرد کو

۱- تحفۃ العلماء: ۲/۲۸۴، ۲۸۵

متعین کر دیا گیا ہو تو سائلین یا جانبین سے واقعے کی تحقیق کر کے مکمل اطمینان کر لیں، یکطرفہ بیان پر جواب نہ دیں۔ نیز جواب دیتے وقت ایسا طرزِ عمل اپنائیں کہ کتمانِ علم کا گناہ بھی سرزد نہ ہو اور کسی کو شریعت کی آڑ میں اپنے جذبۂ انتقام کی تسکین یا غرضِ فاسد کی تکمیل کا موقع بھی نہ ملے۔ مناسب ہے کہ اس موقع پر ایسے تحفظات اختیار کر لیے جائیں کہ فتویٰ غلط استعمال نہ ہو۔

۞ حضرت تھانوی قدس سرہ نے ایک جگہ فرمایا ہے: "میں اہلِ علم کو متنبہ کرتا ہوں کہ فتویٰ میں یہ طریق اختیار کریں کہ کسی کے کہنے سے دوسرے پر فتویٰ نہ لگائیں، اس طرح سے کسی پر کفر کا فتویٰ نہ لگائیں۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے کہا کہ فلاں کا یہ فاسد عقیدہ ہے اور وہ یوں کہتا ہے، میں نے کہا: "جس شخص کا یہ عقیدہ ہو اس سے لکھوا کر لاؤ"[1]۔

۞ ایک مدرسے سے خط آیا کہ ایک مدرس صاحب نے تحریکات میں حصہ لیا تھا اور ڈیڑھ برس تک جیل میں رہے تو قید کے زمانے کی تنخواہ ان کو دینی چاہیے یا نہیں؟ میں نے جواب میں لکھا: "دو باتیں دریافت طلب ہیں:

(۱) نوکر رکھتے وقت اس سے معاہدہ کیا تھا یا نہیں؟

(۲) وہ تنخواہ لینے والے مدرس کیا توجیہ کرتے ہیں؟

صاف لکھو تو جواب دوں"[2]۔

لوگ آج کل علماء کو اپنی جنگ کی آڑ بناتے ہیں اور خود الگ رہتے ہیں، میں ان کی رگوں سے خوب واقف ہوں، جوابوں میں اس کی رعایت رکھتا ہوں، اس لیے یہاں کے جوابوں سے لوگ خوش نہیں ہوتے۔

☆ ایک خط بطور شکایت لکھا آیا تھا کہ یہاں کی انجمن میں اتنے عرصے سے مدِ زکوٰۃ کا روپیہ جمع ہے۔ اگر لوگ ان سے صرف [خرچ] کرنے کو کہتے ہیں یا حساب مانگتے ہیں تو

۱- تحفۃ العلماء: ۲/۲۹۱

۲- حوالہ بالا: ۲/۳۱۴

کوئی جواب نہیں دیتے، ایسی صورت میں شرعی حکم کیا ہے؟

میں سمجھ گیا یہ فتویٰ حاصل کر کے لوگوں کو دکھاتے پھریں گے اور فساد برپا کریں گے۔ میں نے جواب لکھا: "ان انجمن والوں سے اس کا جواب سوال میں درج کروا کر لے کر آؤ کہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ اور پھر جواب حاصل کرو"۔ اب اس جواب سے بھلا کیا خوش ہوں گے؟[1]

(۷) ساتویں وجہ:

مفتی کو عوام کا ایسا تابع نہ ہونا چاہیے کہ وہ جیسا بھی سوال کریں، اس کا جواب ضرور دیا جائے، چاہے وہ ان کے مناسب حال ہو یا نہ؟ اگر کوئی اصرار کرے تو کہہ دیں: مجھے تحقیق نہیں۔ اگر یہ کہتے ہوئے عار آتی ہے تو یوں کہہ دیں: یہ سوال تمہارے فہم سے بالاتر ہے۔

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل طریقوں سے بھی ایسے مستفتی کی اصلاح کی جا سکتی ہے:

۱- ہمیں فرصت نہیں، کسی اور عالم سے پوچھ لیں۔

۲- قرائن سے معلوم ہوتا ہے تحقیق منظور نہیں، لہٰذا تضییعِ وقت سمجھ کر سکوت کیا جاتا ہے۔

۳- معاند یا فضولی کو ٹالنے کا ایک بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے یوں لکھا جائے: "ہمیں جب تک سائل کے بارے میں دو باتوں کا اطمینان نہیں ہوتا جواب نہیں دیتے: ایک سائل کی علمی استعداد، تاکہ جواب رائیگاں نہ جائے، دوسرے اس کی نیت کہ تحقیق کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں۔ آپ کے متعلق دونوں باتیں معلوم کرنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں، لہٰذا جواب سے معذرت ہے"۔[2]

٤- ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ سائل کو اسی کے کسی لفظ میں باندھ دیا جائے۔

شاہ عبد العزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے سائل کے فہم کے مطابق جواب دینے میں کمال عطا فرمایا تھا۔ ایک مرتبہ ان سے کسی نے دریافت کیا: ہندوستان میں جمعہ کی

۱- تحفۃ العلماء: ۲/۲۵۸، ۲۵۹

۲- حوالہ بالا: ۲/۲۷۶، ۲۷۷

نماز پڑھنا کیسا ہے؟ فرمایا: ”جیسا جمعرات کی نماز پڑھنا“۔

✿ ایک مرتبہ کسی نے سوال کیا کہ فاحشہ عورت کی نماز جنازہ پڑھنا کیسا ہے؟ آپ نے فرمایا: ”اس کے آشناؤں کی نماز پڑھنا کیسا سمجھتے ہو؟“

✿ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی شخص نے بذریعہ خط دریافت کیا: ”یاشیخ عبد القادر جیلانی شیئاً للّٰہ!“ کے وظیفہ کا کیا حکم ہے؟ آگے گستاخانہ عبارت تھی، پھر پوچھا گیا تھا: اس کا حکم آپ کو کہاں تک معلوم ہے؟

آپ نے جواب لکھا: ”حکم سے کیا مراد ہے، منصوص یا مستنبط؟“

پھر فرمایا: ”یہ اس کی گستاخی کی سزا ہے۔ وہ اس جواب کے چکر سے مدت تک نہیں نکل سکتا“۔

✿ ایک مرتبہ ایک صاحب کا خط آیا کہ انگریزی پڑھنے کے لیے وقف کرنے پر ثواب ہوگا یا نہیں؟

آپ نے جواب لکھا: ”انگریزی پڑھنے سے کیا نیت ہے؟ اور انگریزی پڑھنے کے قواعد کیا ہیں اور کورس کیا ہے؟ اور اس کی ضرورت کیا ہے؟“

پھر فرمایا: ”اب جیسا جواب دے گا ویسا حکم اس پر مرتب ہوگا“۔

✿ ایک صاحب نے لکھا کہ کافر سے سود لینا کیوں حرام ہے؟ آپ نے جواب میں لکھا: ”کافر عورت سے زنا کرنا کیوں حرام ہے؟“

✿ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جب عوام کی طرف سے اس قسم کے سوالات آتے کہ عرش افضل ہے یا روضۂ اقدس؟ حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہیں یا وفات پاگئے؟ زلیخا سے حضرت یوسف علیہ الصلاۃ والسلام کا نکاح ہوا تھا یا نہیں؟ اصحابِ کہف کی صحیح تعداد کیا تھی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین مؤمن تھے یا نہیں؟ آپ علیہ الصلاۃ والسلام کے

فضلات طاہر تھے یا نہیں؟ وغیرہ وغیرہ اور آپ کو اندازہ ہوتا کہ یہ سوالات بلاضرورت محض بحث مباحثے کی خاطر پوچھے جارہے ہیں تو آپ ان کا جواب دینے کے بجائے یہ تحریر فرماتے تھے:

”ان باتوں کے معلوم ہونے پر ایمان وعمل کا کوئی مسئلہ موقوف نہیں، ان مسائل میں بحث ومباحثے میں وقت خرچ کرنے کے بجائے وہ کام کیجیے جو آخرت میں کام آئے“۔

۞ ایک زمانے میں جب حیاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مسئلے میں بہت زیادہ مباحثے اور مناظرے ہونے لگے اور آپ کے پاس اس مسئلے پر سوالات کی بھرمار ہوئی تو آپ کا طرزِ عمل یہ تھا کہ اگر سوال کسی ذی علم شخص کی طرف سے آیا ہے اور اندازہ یہ ہے کہ اس کا مقصد اپنے کسی شبہے کو دور کرنا یا واقعۃً علمی تحقیق کرنا ہے تو آپ اس کا جواب حسبِ ضرورت اجمال یا تفصیل کے ساتھ دے دیتے، لیکن عموماً جو سوالات عوام کی طرف سے آتے تھے ان کا جواب یہ دیتے:

”اس مسئلے کی تفصیلات کا جاننا آخرت کی نجات کے لیے ضروری نہیں، لہٰذا اس بحث میں پڑنے کی بجائے شریعت کے عملی احکام کا علم حاصل کرنے میں وقت صرف کیجیے۔ ”من حسن إسلام المرء تركه ما لا يعنيه“[1]“

وهكذا كان دأب الأسلاف في مثل هذا، رحمهم الله تعالیٰ رحمة واسعة.

۱۔ البلاغ، مفتی اعظم نمبر: ۱/۳۸۶

سوال وصول کرنے کے بعد

سوال میں نقص، ابہام یا اضافہ:

سوال وصول کر کے مستفتی کے سامنے ہی غور سے پڑھیں۔ اغلاط کو درست اور شکستہ لفظ کو مکمل کریں۔[1]

اگر سوال ناقص یا مبہم ہو تو قابل وضاحت امور خود سائل سے سوالنامہ پر لکھوائیں، اگر وہ موزوں الفاظ نہیں لکھ سکتا تو آپ اسے املا کرواسکتے ہیں۔[2]

اگر سوال میں اضافے کا موقع نہ بنتا ہو تو جواب میں یوں لکھیں: "سائل نے زبانی طور پر اضافی بات بتائی ہے، اگر یہ صحیح ہے تو......"

یا یوں لکھیں: "جیسا کہ سائل کے زبانی بیان سے معلوم ہوا......"[3]

۞ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک شخص ایک تحریری استفتاء لایا، حضرت نے فرمایا: "اس میں یہ بات درج نہیں ہے کہ جو شخص طلاق دینا چاہتا ہے، اس نے نکاح کے بعد صحبت کی یا نہیں؟ کیونکہ اس سے حکم بدل جائے گا"۔ اس نے کہا کئی سال نکاح کو ہوئے، صحبت ضرور کی ہے۔ حضرت نے فرمایا: اس میں تو یہ نہیں لکھا، اگر تم یہ بات صرف زبانی کہتے ہو تو مسئلہ کا جواب بھی زبانی سن لو، یا اس میں لکھوانا چاہتے ہو؟ اس نے

۱- وإذا وجد كلمة مشتبهة، سأل المستفتي عنها، ونقطها وشكلها، وكذا إن وجد لحنا فاحشا أو خطأ يحيل المعنى، أصلحه. (مقدمة المجموع: ٤٨)

۲- قال الصيمري: وليس من الأدب كون السؤال بخط المفتي، فأما بإملائه وتهذيبه فواسع. (المصدر السابق: ٤٧، ٤٨)

۳- قال أبوعمرو بن الصلاح: "ولابأس أيضا لو كتب بعد جوابه عما في الرقعة: زاد السائل لفظه من كذا وكذا أو الجواب عنه كذا وكذا". (أدب المفتي والمستفتي: ٧٨)

کہا: میں اس میں لکھوانا چاہتا ہوں۔ حضرت نے فرمایا: "پھر جب اس میں لکھ کر لاؤ گے تب اس میں جواب لکھا جائے گا"۔

سوال کی تکمیل سائل سے کروایئے:

جواب کی توضیح اور اس میں درج حقائق کی صحت کی تمام تر ذمہ داری سائل پر ڈالیں۔ سوال مبہم ہو تو خود سے اس کا کوئی مطلب متعین کر کے جواب نہ لکھیں، سائل کا مطلب کچھ اور بھی ہوسکتا ہے۔ بہتر ہے کہ جب سوال میں ایسا ابہام یا اجمال ہو جو سمجھ میں نہ آئے تو مستفتی کو بالمشافہہ حاضر ہونے کا کہہ دیں۔ ڈاک سے آمدہ سوال پر " فلاں فلاں امور کی وضاحت کریں" لکھ کر بھیج دیں۔[1]

تردید یا تشقیق ممنوع ہے:

جواب کبھی تردید یا تشقیق کے ساتھ نہ دیں، یعنی یوں نہ لکھیں: "اگر سائل کی نیت یہ تھی تو حکم یہ ہوگا، اگر یہ نیت تھی تو حکم یوں ہوگا" یا "فلاں صورت ہو تو یہ حکم ہے ورنہ یہ حکم"۔ اس سے تزویر (جعل سازی) اور غلط بیانی کا دروازہ کھل جاتا ہے، سائل کو جس صورت میں فائدہ ہوتا ہے، وہ دانستہ، شعوری یا لاشعوری طور پر یا نادانستہ اس کا دعویٰ کرنے لگتا ہے۔ نیز ان شقوں کے خلط ہونے کا امکان ہے، ہر سائل کو اتنی تمیز نہیں ہوتی کہ ہر شق کے جواب کو علیحدہ

۱- إذا لم يفهم المفتي السؤال أصلا، ولم يحضر صاحب الواقعة، فقال الصيمري: يكتب: يزاد في الشرح ليجيب عنه، أو لم أفهم ما فيها فأجيب. قال: وقال بعضهم: لايكتب شيئا أصلا، قال: ورأيت بعضهم كتب في هذا: يحضر السائل لنخاطبه شفاها. وقال الخطيب: ينبغي له إذا لم يفهم الجواب، أن يرشد المستفتي إلى مفت آخر إن كان، وإلا فليمسك حتى يعلم الجواب." قال الصيمري: إذا كان في رقعة الاستفتاء مسائل فهم بعضها دون بعض، أو فهمها كلها ولم يرد الجواب في بعضها، أو احتاج في بعضها إلى تأمل أو مطالعة، أجاب عما أراد وسكت عن الباقي، وقال: لنا في الباقي نظر أو تأمل أو زيادة نظر. (مقدمة المجموع: ص۵۲)

علیحدہ کرکے اس کے صحیح محمل پر منطبق کرسکے، لہٰذا سوال وصول کرتے وقت غور سے پڑھ کر تردید یا تشقیق کرکے سوال کو منقح تو کرلیں، مگر جواب میں تمام صورتیں نہ لکھیں۔ تنقیح کرتے وقت اشارہ وکنایہ میں بھی سائل کو پتہ نہ چلنے دیں کہ کونسی صورت میں اس کا فائدہ ہے؟ اس سے حقیقت کو واضح کروائیں لیکن خود حکم کو مبہم رکھیں۔ (۱)

درمختار میں ہے:"وشرط بعضهم تيقظه".

وفى الشامية: "احتراز عن من غلب عليه الغفلة والسهو، قلت : وهذا شرط لازم فى زماننا؛ فإن العادة اليوم أن من صار بيده فتوى المفتى استطال على خصمه، وقهره بمجرد قوله: "أفتاني المفتى بأن الحق معى".والخصم جاهل لايدرى ما فى الفتوىٰ،فلابد أن يكون المفتى متيقظاً، يعلم حيل الناس ودسائسهم، فإذا جاء السائل يقرره من لسانه ولايقول له: "إن كان كذا فالحق معك ، وإن كان كذا فالحق مع خصمك"؛ لأنه يختار لنفسه ما ينفعه، ولا يعجز عن إثباته بشاهدى زور، بل الأحسن أن يجمع بينه وبين خصمه، فإذا ظهر له الحق مع أحدهما كتب الفتوى لصاحب الحق، وليحترز من الوكلاء فى الخصومات، فإن أحدهم لايرضى إلا بإثبات دعواه لموكله بأىّ وجه أمكن، ولهم مهارة فى الحيل والتزوير، وقلب الكلام، وتصوير الباطل بصورة الحق، فإذا أخذ الفتوى قهر خصمه، ووصل إلى

١- وإذا كان فى المسألة تفصيل لم يطلق الجواب، فإنه خطأ، ثم له أن يستفصل السائل إن حضر، ويقيد السؤال فى رقعة أخرى ثم يجيب، وهذا أولى وأسلم، وله أن يقتصر على جواب أحد الأقسام إذا علم أنه الواقع للسائل، ويقول: هذا إذا كان الأمر كذا، وله أن يفصل الأقسام فى جوابه ويذكر حكم كل قسم، لكن هذا كرهه أبو الحسن القابسى من أئمةالمالكية وغيره، وقالوا: هذا تعليم للناس الفجور. وإذا لم يجد المفتى من يسأله، فصل الأقسام واجتهد فى بيانها واستيفائها. (مقدمة المجموع للإمام النووى: ص ٤٨، وانظر أيضا: تحفة العلماء: ٢/٢٨٧-٢٩٠، ٣١٥)

غرضه الفاسد، فلا يحل للمفتي أن يعينه على ضلاله، وقد قالوا: "من جهل بأهل زمانه فهو جاهل".

وقد يسأل عن أمر شرعي، وتدل القرائن للمفتي المتيقظ أن مراده التوصل به إلى غرض فاسد، كما شاهدناه كثيراً.

والحاصل: أن غفلة المفتي يلزم منه ضرر عظيم في هذا الزمان، والله المستعان".(١)

ایسے موقع پر تمام شقوں کا جواب لکھنے کے متعلق بعض ائمہ نے فرمایا ہے: "هذا ذريعة إلى تعليم الناس الفجور؛ لأنه يفتح للخصوم باب التمحل والاحتيال الباطل".(٢)

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ ایک قصبہ میں غلطی سے رضاعی بہن بھائی کا نکاح ہوگیا اور یہ بے خبری میں ہوا، کسی کو پتہ نہیں تھا۔ (اسی وجہ سے فقہاء نے لکھا ہے کہ دودھ پلانے والی مشہور کردے میں نے فلاں جگہ دودھ پلایا ہے) نکاح کے بعد پتہ چلا، علماء سے استفتاء کیا، سب نے حرام بتلایا۔ مجھ سے کہا گیا: "اجی! اس میں تو بدنامی ہوگی۔" میں نے کہا: "اور اس میں بدنامی نہ ہوگی کہ بہن بھائی ایک جگہ جمع ہیں۔" اس نے کہا: "وہ دودھ تو رہا بھی نہ تھا، ویسے ہی نکل گیا تھا"۔ میں نے کہا: "دودھ تو نکل گیا تھا، حرمت نہیں نکلی تھی، وہ تو اس کے پیٹ میں بیٹھ گئی"۔

بس وہ غیر مقلد کے ہاں دہلی پہنچا، کسی نے کہہ دیا: اگر پانچ گھونٹ سے کم پیے ہوں تو حلال ہے ورنہ حرام۔ بس سائل نے سن کر فوراً سوال قائم کیا: "کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ زید جس نے ایک عورت کا دودھ پانچ گھونٹ سے کم پیا ہے اور ہندہ جس نے

١- الشامية: ٤/ ٣٠١، ٣٠٢

٢- فتاوی ابن الصلاح: ١/ ٧٢

پوری مدت اس عورت کا دودھ پیا ہے، تو یہ ہندہ اس زید کے نکاح میں حلال ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا"۔ بس کیا تھا انہوں نے لکھ دیا: حلال ہے۔ ان کے ہاں تو مسئلہ یہی ہے۔ ایک حنفی عالم نے بھی فتوی دیکھ کر کہا: "کیا حرج ہے، یہ بھی تو ایک مذہب ہے"۔ مگر پوچھنا تو یہ ہے آیا سوال کا واقعہ سن کر جواب تراشا گیا یا وہاں بیٹھ کر کسی نے گھونٹ شمار کیے تھے؟

جواب لکھتے وقت

جواب کو قاطع اشکال ہونا چاہیے:

جواب ہمیشہ ایسا ہونا چاہیے جس سے منشأ اشکال ختم ہوجائے[1]، بعض مرتبہ کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کا جواب دیے بغیر سائل کی تشنگی دور نہیں ہوتی، ایسی صورت میں اصل جواب کے ساتھ اُس امر کی وضاحت بھی کرنی چاہیے۔

مثلاً: سائل نے پوچھا شوہر نے طلاق دے دی ہے، لیکن بیوی حائضہ تھی یا حمل سے تھی۔ ایسے سوال میں صرف یہ لکھ دینا کافی نہیں: "طلاق واقع ہوگئی ہے" بلکہ یہ بھی لکھنا چاہیے: "حیض میں دی گئی طلاق واقع ہوجاتی ہے" یا "حمل طلاق سے مانع نہیں"۔

یا مثلاً: سائل نے دریافت کیا زید کی وفات کے وقت اس کی بیوہ، دو لڑکے اور تین لڑکیاں زندہ تھیں، اس کے والدین وفات پا چکے ہیں، اس کا ترکہ کیسے تقسیم ہوگا؟ جبکہ زید کی بیوہ نے دوسری شادی کرلی ہے، یا زید نے ایک لڑکے کو عاق کردیا تھا؟

اس سوال کے جواب میں بیوہ اور عاق شدہ لڑکے کا حصہ بتا دینا کافی نہیں، ساتھ یہ لکھنا بھی ضروری ہے: "بیوہ کا حق دوسری شادی سے ساقط نہیں ہوتا" نیز "عاق کرنا شرعاً معتبر نہیں، نافرمان لڑکا بدستور وراثت کا حقدار ہے"۔

---

١ - يلزم المفتي أن يبين الجواب بياناً يزيل الإشكال. (مقدمة المجموع: ٤٧)

ذیل میں دیے گئے سوال کو پڑھیے۔ اس کے جواب میں صرف یہ لکھنے پر اکتفا کرنا کہ بیمہ ناجائز ہے، درست نہ ہوگا بلکہ سائل کے اُٹھائے گئے اشکال کو حل کرنا بھی ضروری ہوگا۔

سوال: ہمارے ماموں انشورنس کمپنی میں کام کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہماری کمپنی کا طریقۂ کار صحیح ہے، کیونکہ اس کا منافع کم اور زیادہ ہوتا رہتا ہے۔ ہماری کمپنی، گورنمنٹ پروجیکٹ اور اسٹاک ایکسچینج میں انویسٹمنٹ کرتی ہے۔ اس طرح وہ کہتے ہیں یہ جائز ہے۔

اب آپ مہربانی فرما کر اپنی تحقیق سے یہ فتویٰ دیں کہ آیا اس میں ملازمت کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ اگر صحیح تو کیوں اور اگر غلط ہے تو کیوں؟ وضاحت سے تحریر کردیں تو نوازش ہوگی۔

الجواب:

موجودہ بیمہ کمپنیوں کی تمام شکلیں سود اور جوا پر مشتمل ہونے کی وجہ سے حرام اور ناجائز ہیں۔ جب تک صحیح اسلامی بنیادوں پر کوئی بیمہ کمپنی وجود میں نہ آئے اور علمائے کرام اس کے طریقۂ کار کے صحیح ہونے کا فتویٰ نہ دیں، اس وقت تک سوال میں ذکر کردہ ادارے سمیت کسی بھی مروجہ بیمہ کمپنی کی پالیسی لینا یا اس میں ملازمت کرنا جائز نہیں۔

جہاں تک سائل کے ماموں کی بات ہے تو وہ قطعاً صحیح نہیں، کیونکہ اولاً تو بیمہ کمپنیوں کا سرمایہ سودی کاروبار میں لگا ہوا ہوتا ہے اور اگر کسی اور کام میں لگایا گیا ہو تو بھی ان کے معاہدہ کرنے اور نفع تقسیم کرنے کا نظام شریعت کے مطابق نہیں، اس لیے کہ کسی کاروبار کے جائز ہونے کے لیے محض یہ بات کافی نہیں کہ اس کے منافع کم یا زیادہ ہوتے رہتے ہوں بلکہ دیگر شرعی شرائط کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ منافع کی شرح، کاروبار میں ہونے والے حقیقی منافع کی نسبت سے طے کی جائے، جبکہ مروّجہ بیمہ کمپنیاں منافع کے متناسب حصے کے بجائے عوام کی طرف سے جمع کرائے گئے سرمایہ کے تناسب سے انہیں نفع دیتی ہیں جو کہ خالص سود ہے، لہٰذا سائل کے ماموں کا موقف درست نہیں۔

تصحیحِ عقد یا تجویزِ متبادل:

مفتی کی ذمہ داری صرف اس پر ختم نہیں ہوتی کہ وہ جواب میں فقط اتنا لکھ دے:

"یہ صورت ناجائز یا حرام ہے"۔ اگر صرف اسی پر اکتفا کیا جائے تو خطرہ ہے کہ بہت سے لوگ دین سے مایوس وناامید ہوکر اس طرح بیزار ہوجائیں گے کہ ان کو خبر تک نہیں ہوگی کہ وہ مذہب سے منحرف یا معاذ اللہ مرتد ہوگئے ہیں۔ اس لیے اگر اس عقد کی تصحیح ہوسکتی ہو، یا متبادل جائز صورت ممکن ہو تو جواب میں اس کی ضرور نشاندہی کرنی چاہیے[1]۔

ذیل میں دونوں کی مثالیں دی جاتی ہیں:

تصحیحِ عقد:

ایک شخص نے اپنا مکان بعوض اٹھتر ہزار روپے (جس کا نصف انتالیس ہزار بنتے ہیں) فروخت کیا، جس کا سٹامپ پیپر مندرجہ ذیل شرائط پوری ہونے پر لکھ دیا جائے گا:

(۱) ماہانہ قسط پانچ ہزار روپے کی ادائیگی ہر ماہ کی دس تاریخ کو ہوگی۔

(۲) مکان کی قیمت میں سے چالیس ہزار روپے وصول ہونے تک ماہانہ کرایہ پانچ

۱- اگر فساد صلب عقد میں نہ، ہو خارجی وجہ سے ہو اور زائل کیا جاسکتا ہو تو اسی عقد کی تصحیح کردی جاتی ہے اور اگر عقد سرے سے باطل ہو اور بحالت موجودہ اس کی تصحیح ممکن نہ ہو تو متبادل تجویز کیا جاتا ہے۔ حضرات فقہائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کے ہاں "حیلہ" کے نام سے جو اصطلاح معروف ہے، یہ عمل اس کے قریب قریب ہے۔

"قال الخصاف: قلت لأحمد بن محمد بن سماعة:ما تقول فی رجل یقول الحیل؟ قال: "لابأس بالحیل فیما یحل ویجوز، وإنما الحیل شیء یتخلّص به الرجل من المآثم والحرام، ویخرج به إلی الحلال ، فما کان من هذا أو نحوه فلابأس، وإنما یکره من ذلك أن یحتال الرجل فی حق الرجل حتی یبطله، أو یحتال فی شیء فیه شبهة". (الخصاف فی الحیل، إمام أبوبکر الخصاف الشیبانی:٤)

سو روپے بائع حاصل کرتا رہے گا۔

(۳) جس دن ساٹھ ہزار روپے کی ادائیگی ہوگی، بائع نصف کرایہ لینے کا حقدار ہوگا۔

(٤) جس دن کل رقم ادا کردی جائے گی اس وقت سے مشتری مکمل مکان کا مالک ہوگا اور اسے سٹامپ پیپر لکھ دیا جائے گا۔

واضح ہو کہ یہ مکان بیع کے وقت سے کرایہ پر ہے، مشتری کرایہ داری کو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ ارشاد فرمایا جائے یہ معاملہ از روئے شرع شریف درست ہے یا نہیں؟

اب اس معاملے کی حقیقت یہ ہے کہ عقدِ بیع میں یہ شرط لگائی گئی ہے کہ بیع کے بعد بائع کچھ مدت تک مبیع کا مکمل کرایہ اور کچھ مدت تک نصف کرایہ وصول کرے گا یعنی آٹھ مہینے تک پانچ سو اور چار مہینوں تک دو سو پچاس روپے، ظاہر ہے کہ یہ شرط مقتضائے عقد کے خلاف ہونے کی وجہ سے مفسد للعقد ہے، عقدِ بیع کا مقتضیٰ یہ ہے کہ بیع ہوتے ہی مبیع کے عین اور منافع دونوں کا مالک مشتری ہوجائے، کرایہ مبیع کی منفعت کا عوض ہے، اس کا حقدار بھی مشتری کو ہونا چاہیے، بائع اس کو وصول کرنے کی شرط لگائے گا تو عقد فاسد اور واجب الفسخ ہوجائے گا۔

لیکن اس سوال کے جواب میں صرف اتنا لکھنا کافی نہ ہوگا، بلکہ اس شرط سے چونکہ بائع کی ایک غرضِ صحیح متعلق ہے وہ یہ کہ مشتری رقم کی ادائیگی سے پہلے مکان پر ناجائز قبضہ نہ کر بیٹھے، لہٰذا حدودِ شریعت کے اندر رہتے ہوئے کوئی ایسی صورت نکالنی چاہیے کہ بائع کو مطلوبہ تحفظ حاصل ہوسکے اور مشتری تاجیلِ ثمن کا احسان ماننے کی بجائے خداع کرنا چاہے تو اس کا سدِ باب ہوسکے۔ اس کی صورت مثلاً یہ ہوسکتی ہے کہ اس اضافی رقم کو اجرت کی بجائے ثمن کا حصہ بنایا جائے، یعنی یہ کل پانچ ہزار بنتے ہیں، عاقدین کو چاہیے کہ مکان کی قیمت اٹھتر ہزار سے بڑھا کر تراسی ہزار کردیں، اور ماہانہ قسط پانچ ہزار کی بجائے پہلے آٹھ مہینوں تک پانچ ہزار پانچ سو اور پھر چار مہینوں تک پانچ ہزار دو سو پچاس مقرر کی جائے۔ مشتری پر لازم ہوگا

کہ یہ اضافی رقم بطور قیمت ادا کرے، چاہے کرایہ سے وصول کر کے، چاہے اپنے پاس سے۔ اور جب تک قیمت ادا نہ ہوگی مکان کے کاغذات بائع کے پاس گروی رہیں گے۔ اب عقد بھی صحیح ہوگا اور بائع کا جائز مقصد بھی پورا ہو جائے گا۔

ذیل میں امداد الفتاویٰ سے تصحیح عقد کی دو مثالیں دی جاتی ہیں، عبارت کی تفہیم و تسہیل کے لیے مربع قوسین میں تشریحی الفاظ بڑھا دیے گئے ہیں۔

سوال:

یہاں شیرہ کی تجارت کی صورت یہ ہے کہ کھنسال [وہ جگہ جہاں گنے سے رس نکال کر پکاتے ہیں تو پتلا گڑ بن جاتا ہے] والوں کو شیرہ کی فصل سے پہلے روپیہ دے دیا جاتا ہے اور نرخ اسی وقت قرار پا جاتا ہے کہ ہم فصل میں اس نرخ سے شیرہ لیں گے اور اتنا روپیہ دیتے ہیں۔ یہ بات قرار پا جاتی ہے [یہ پہلا عقد ہوا جو بیع سلم ہے اور مسلم فیہ کے انقطاع کے وقت ہو رہا ہے] جب فصل آئی اور جو بھی نرخ ہوا، مالک جتنا شیرہ نکالتا جاتا ہے خود اس ہی نرخ سے فروخت کرتا رہتا ہے اور مقررہ تعداد فروخت ہو جانے پر حساب کر دیتا ہے [یہ دوسرا عقد ہے جس میں رب السلم کے قبضے سے پہلے مسلم الیہ کو مسلم فیہ کی بیع کا وکیل بنایا گیا ہے اور یہ توکیل، بیعِ سلم کے ساتھ مشروط ہے اور بلا اجر ہے] مثلاً: زید نے عمرو کو سو روپے دیے اور یہ بات قرار پائی کہ چھ سیر کا شیرہ چھ سو سیر ہمارا رہا، [یعنی سو روپیہ رأس المال ہے اور فی روپیہ چھ سیر کے حساب سے چھ سو سیر مسلم فیہ قرار پایا] جب فصل آئی اور شیرہ راب [گنے کا رس] میں سے نکلتا گیا اور نرخ تین سیر ہو گیا تو مالک اس کو بحساب تین سیر فروخت کرتا رہا، جب چھ سو سیر نکل چکا تو اس نے حساب کر دیا۔ [یعنی مسلم فیہ کی قیمتِ فروخت رب السلم کے حوالے کر دی]

الجواب:

فی الدر المختار فی السلم: "شُرط دوامُ وجوده"، وفیه:" شرَط حمله إلی منزله بعد الإیفاء فی المکان المشروط لم یصح؛ لاجتماع الصفقتین: الإجارةو التجارة " ، وفیه: "لا یجوز التصرف" إلی قوله: "ولا لرب السلم فی المسلم فیه قبل قبضه".

پس اولاً قبل فصل سلم ٹھہرانا جائز نہیں ؛للروایة الأولی اور [ثانیاً] اگر بعد فصل ٹھہرائیں تو جب تک شیرہ پر خود رب السلم قبضہ نہ کرلے اس میں تصرف کرنا جیسا بیع کرنا خواہ خود خواہ بذریعۂ وکیلِ غیر قابض جائز نہیں اور یہاں وکیل بائع ہے جس کا قبضہ بجائے خود رب بیع سلم نہیں [اس لیے کہ وہ اصیل ہے اور بیع میں ایک جانب کا اصیل دوسری جانب سے وکیل نہیں بن سکتا؛ الواحد لایتولی طرفی العقد فی البیع بخلاف النکاح] اس لیے یہ بیع منجانب رب السلم نہیں، للروایة الثالثة اور [ثالثاً] اگر خود رب السلم بھی قبضہ کرے تب بھی یہ شرط ٹھہرانا کہ مسلم الیہ بیع کرایا کرے گا، شرط زائد ہے اور [رابعاً] صفقۂ توکیل کا صفقۂ سلم کے ساتھ جمع کرنا ہے،اس لیے جائز نہیں،للروایة الثانیة [یہاں تک اس معاملے کی چار خرابیاں گنوائی گئیں۔ آگے بالترتیب ان کی اصلاح کر کے اس عقد کی تصحیح کی گئی ہے] البتہ اگر فصل میں مسلم فیہ موجود ہو اور توکیل مشروط نہ ہو اور بعد تیاری شیرہ قبضہ کر کے بتوکیل جدید مسلم الیہ کو وکیل بنادے تب جائز ہے ،فقط واللہ اعلم۔[1]

سوال:

قصاب رعایا میں ہمیشہ سے یہ دستور ہے کہ بمقابلہ دیگر اشخاص کے زمیندار کو [جس کی زمینوں پر رہتے ہیں] کم نرخ پر گوشت دیتے ہیں [یہ حط الثمن بدون رِضا البائع ہے] اور

۱- امداد الفتاویٰ: ۳/ ۷۰

بعض جگہ ایک آنہ سیر معین ہے خواہ نرخ کچھ ہو [اس میں حط وزیادت دونوں کا احتمال ہے اور فریقین میں سے ایک پر تعدی ہے] یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:

ایک طرح جائز ہے [جواز کی یہ تاویل اس عقد کی تصحیح ہے] کہ وہ قصاب اس زمیندار کے مکان میں مثلاً رہتا ہو اور کوئی انتفاع اس سے ایسا حاصل کرتا ہو جس کی اجرت لینا شرعاً جائز ہو اور اس اجرت میں یہ بات ٹھہر جاوے کہ ہر ماہ اس قدر گوشت ہم اتنے نرخ پر لیں گے [یہ اجرت کی تعیین ہوئی] اور مہینے میں اس مقدار سے زیادہ نہ بڑھیں [تاکہ اخذ بلاعوض لازم نہ آئے] کم رہے تو مضایقہ نہیں [زمیندار کی طرف سے حط اجرت ہو جائے گا] اس طرح درست ہے۔ [یعنی إجارة منفعة الدار باللحم کی تخریج پر] جتنا احتمال مہینہ بھر میں ہو اس سے کچھ زیادہ مقدار ٹھہرا لینے میں خطرہ نہ رہے گا [کہ اجرت تو کوئی بھی مقدار ہو سکتی ہے] مگر حساب یاد رکھنا ہوگا [تاکہ مبیع سے زیادہ نہ لیں اور اکل بالباطل سے بچ سکیں]

متبادل صورت:

زرعی علاقوں میں یہ مسئلہ عمومِ بلویٰ کی صورت اختیار کر گیا ہے کہ دانے صاف کرنے یا پسوانے کی اجرت اسی غلے میں سے دی جاتی ہے جو صاف کرانے یا پسوانے کے لیے دیا جائے، جبکہ یہ حدیث " قفيز الطحان" کی رو سے ناجائز ہے، لیکن اس قسم کے سوال کے جواب میں فقط ناجائز لکھ دینا کافی نہیں، بلکہ سائل کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے ساتھ ہی متبادل صورت تحریر کرنی چاہیے۔ مثلاً: یہ کہ دانہ صاف کرنے یا پسوانے سے پہلے تھریشر یا چکی والے کی اجرت الگ کر کے اسے دے دی جائے تو یہ معاملہ جائز ہوگا، وغير ذلك من الحيل المذكورة فى هذه المسئلة. امداد الفتاویٰ سے لی گئی ذیل کی مثال کو غور سے پڑھیے:

سوال:

زید کا روپیہ عمرو کے ذمہ باقی ہے اور مدت مہلت گزر چکی۔ [یعنی فریقین کے درمیان عقد مداینہ مؤجلہ ہوا ہے اور اجلِ دین آ چکی ہے] زید نے [جو کہ دائن ہے عمرو سے جو کہ مدیون ہے] کہا: اگر تمہارے پاس روپیہ نہیں ہے تو مال تمہارے پاس بہت موجود ہے۔ تم قرض اپنا مال ہم کو دے دو [یہ دین نفع کی وصولی کا ایک طریقہ ہے کہ مدیون سے کہا جائے تم اپنی کوئی چیز ہمیں فروخت کر دو پھر ہم سے ادھار پر زیادہ قیمت سے خرید لو۔ اصل دین کا دین سے مقاصہ ہو جائے گا اور اوپر کا نفع بھی مدیون سے وصول کرنے کا حیلۂ فاسدہ نکل آئے گا] مگر مال ہم خود دیکھ کر لیں گے اور جو ہم نے دیا تھا وہ مال نہ لیں گے، اس وقت جو مال تمہارے پاس موجود ہے اس میں سے چھانٹ لیں گے اور نہ تمہاری خرید پر لیں گے بلکہ جیسا جچے گا وہ لیں گے۔ [یہ ساری شرائط مدیون کے دباؤ میں ہونے کی وجہ سے لگائی جا رہی ہیں] عمرو نے کہا اچھا لے لو۔ [یہ فریقین کے درمیان دوسرا عقد ہے جو بیع مؤجل ہے] زید نے عمرو سے مال خریدا اور کہا کہ قرض ہمارے ذمہ ہے، ہم دو چار روز میں اس مال کا روپیہ دے دیں گے۔ [یہ قیمت درحقیقت دائن ادا نہیں کرے گا بلکہ اپنے سابقہ دین کے بدلے مقاصہ کر لے گا] عمرو نے کہا اچھا۔ پھر زید نے کہا اب ہمارے اس مال کو اگر تم منافع سے خریدتے ہو تو خرید لو۔ عمرو نے کہا کہ میں اتنے منافع سے خریدتا ہوں مگر روپیہ ایک ماہ میں دوں گا۔ [یہ مجموعی طور پر تیسرا عقد ہے جو مرابحہ مؤجلہ ہے] زید نے کہا اچھا لے لو [یہاں دائن ادھار خریدا ہوا مال واپس مدیون کو نفع پر ادھار بیچ رہا ہے۔ گویا فریقین بیع مؤجل کے بعد مرابحہ مؤجلہ کر رہے ہیں] زید نے اپنے قبضہ سے عمرو کے قبضہ میں دے کر شمار کرا دیا۔

الجواب:

یہ حرام ہے کہ اُدھار کی یہ رعایت بوجہ عمرو کے مدیون ہونے کے ہے [جیسے کہ زید کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے: ''اگر تمہارے پاس روپیہ نہیں ہے تو مال تمہارے پاس بہت

موجود ہے۔ ہمارے پاس روپیہ نہیں ہے تم قرض اپنا مال ہم کو دے دو۔" یہاں تک حکم ہوا۔ آ گے متبادل کی تجویز ہے] البتہ یہ جائز ہے کہ زید کا جتنا روپیہ عمرو کے ذمہ رہ گیا ہے اس کے عوض میں مال اس طرح خریدے کہ وہ روپیہ مجرا ہوجائے [یعنی زید اپنے قرض کے بدلے عمرو سے ادھار مال نہ لے بلکہ نقد خرید کر مقاصّہ کرلے] پھر عمرو کو اختیار ہے خواہ اس مال کو خریدے یا نہ خریدے۔[1]

اجتماعِ تصحیح وتجویز:

ذیل میں دیے گئے سوال میں "تصحیحِ عقد" اور "تجویزِ متبادل" دونوں اکٹھے پائے جارہے ہیں۔

سوال:

ایک بازار میں یہ رواجِ قدیم مابین ہندو ومسلمان مقرر ہے کہ ہندو ومسلمان گاڑی بان جب اپنا مال یعنی قندِ سیاہ باہر سے لاکر وہاں کے تجارت پیشہ ہندو مسلمان کارخانہ چینی والے کے ہاتھ بیچتے ہیں تو کل قیمت اپنی لے کر اس میں سے ایک آنہ حسبِ رواج وہاں کے بغرض مصارفِ مدرس وامام مسجد وپجاری شوالہ[2] بخوشی دیتے ہیں جس کو امام مسجد وپجاری لے کر اپنے تصرف میں لاتے ہیں[اس معاملے کی حقیقت، تبرع المسلم لمعابدالمشرکین اور قبول تبرع المشرکین لمساجد المسلمین ہے] خواہ وہ خریدار مال ہندو ہو یا مسلمان ہو،اس رقم کو اپنے پاس امانۃً رکھتا ہے اور کل رقم وصول شدہ اپنے اپنے موقع پر یعنی بوقت طلب پجاری وامام کو دیتا ہے [یہاں دوسرا نکتۃ الغور ہے کہ تبرع مذکور سابقاً میں ذریعہ بننا کیسا ہے؟] نہ ہندو کارخانہ والوں کو مسلمان مدرس وامام کے

١- امداد الفتاویٰ: ٣/٧٦،٧٧

٢- شوالہ: مہادیو کا استھان، شیو جی کا مندر۔

دینے میں عذر ہے نہ مسلمان کارخانہ والوں کو ہندو پوجاری کے دینے میں رقمِ معلومہ کے کوئی حجت پیش ہوتی ہے۔ اسی طرح سے ایک زمانۂ دراز سے سلسلۂ انتظام قائم ہے، اب اس وقت بعض مسلمانوں کو یہ تردد پیش ہے کہ اس طرح کی رقم امانت کا ہندو و مسلمان کو اپنے پاس رکھنا اور ان کے پوجاری کو یا مدرس و امام مسجد کو دینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ [یہ امر دوم یعنی قبول تبرع المشرکین للمساجد سے متعلق سوال ہے] اور ایسی مشارکت دینی کاموں میں روا ہے یا نہیں؟ [یہ امر اول یعنی تبرع المسلم لمعابد المشرکین سے متعلق ہے علی اللف والنشر غیر المرتب]

الجواب:

درست نہیں [یعنی نہ تبرّع نہ اس کے لیے وکالت، یہ اصل حکم ہوا۔ آگے اس معاملے کی تصحیح ہے] سب مل کر اس انتظام کو اس طرح بدل دیں کہ ہندو صرف ہندوؤں سے لیا کریں اور مساجد میں خرچ نہ کریں اور مسلمان صرف مسلمانوں سے لیا کریں اور پوجاریوں پر خرچ نہ کریں [یہاں تک تصحیح ہے۔ آگے متبادل کی تجویز شروع ہو رہی ہے] اور جب تک ایسا انتظام مقرر نہ ہو تو مسلمان ایسا کریں کہ [یہ مندر کے لیے تبرع قبول کرنے سے بچنے کا طریقہ ہے] اگر ہندوؤں سے ان کو لینے کا موقع آوے نہ لیں کہ اختیاری بات ہے اور جب نہیں لیں گے تو ان سے کوئی پجاری بھی نہیں مانگ سکتا اور اگر مانگے [یعنی پجاری مندر کے لیے جمع شدہ رقم طلب کرے] تو یہ جواب دے سکتا ہے کہ ہم نے خود ہی ہندوؤں سے نہیں لیا ہے تو ہم تم کو کیسے دیں؟ اور اگر ہندوؤں کو وہ ایک آنہ دینے کا موقع پڑے اور وہ مجبور کر کے لینا چاہیں تو یوں کرے کہ [یہ مندر کے لیے عطیہ دینے سے بچنے کا طریقہ ہے] دام پورے وصول کر کے ایک آنہ واپس نہ دے بلکہ اس سے یوں کہے کہ مجھ کو ایک آنہ قیمت مجوزہ میں کم دے دو اور نیت یہ رکھے کہ میں ایک آنہ اس کو معاف کرتا ہوں [حط الثمن یا ابراء بعض الدین کے طور پر، پھر وہ ہندو اپنی طرف سے مندر کو دے تو یہ

اس کا اپنا فعل ہوگا] اور مسلمان سے لینا بھی جب درست ہے کہ وہ خوشی سے دے اور جو شخص کہ محض اس رسم کی پابندی سے دیتا ہو اس سے لینا جائز نہیں۔ [یہ إجابة السائل باکثر مما سأل ہے تاکہ جواب کی تکمیل ہوجائے][1]

ضرورت صحیحہ کے بغیر تصحیح و تجویز نہیں ہوتی:

یاد رکھیے! ہر معاملے کی تصحیح نہیں کی جاتی نہ ہر مشکل کا متبادل تجویز کیا جاتا ہے، یہ محنت صرف ان معاملات میں کی جاتی ہے جن کی سائل کو ضرورت واقعیہ صحیحہ معتبرہ فی الشرع ہو اور اس کو مشکل کا حل نہ ملنے کی وجہ سے ضرر پہنچے یا حرج لاحق ہو۔ اگر قرائن سے معلوم ہو کہ اس معاملہ کی ضرورت واقعیہ نہیں، بلکہ اس سے مقصود ناجائز سہولیات کا حصول، اغراض فاسدہ تک رسائی، یا مقاصد شرع کی نفی ہے تو اس عقد کی تصحیح کی جاتی ہے نہ متبادل تلاش کرنے پر سر کھپایا جاتا ہے، بلکہ موکد الفاظ میں اس سے منع کیا جاتا ہے اور اگر کسی مفتن کی طرف سے اس معاملہ کو کسی عقد کے تحت لاکر جائز کرنے کی کوشش کی جائے تو اس کا مکمل رد کیا جاتا ہے۔ حیلہ صحیحہ اور فاسدہ میں بنیادی فرق یہی ہے کہ اول سے دائرہ شریعت میں رہتے ہوئے اور مقاصد شرع کی نفی سے بچتے ہوئے دفعِ ضرر یا رفعِ حرج مطلوب ہوتا ہے، جبکہ دوم سے احکام شرعیہ کو توڑ مروڑ کر غیر ضروری سہولت پسندی یا چور راستے سے ممنوعاتِ شرعیہ تک رسائی پیشِ نظر ہوتی ہے۔ ذیل میں امداد الفتاوی سے ایک مسئلہ دیا جارہا ہے۔ اس کا تجزیہ و تحلیل کر کے نکتۃ الغور متعین کیجیے اور دیکھیے کہ اس کے پس منظر میں موجود غرض فاسد کا سدّ باب کتنے مضبوط طریقے سے کیا گیا ہے۔

١- امداد الفتاویٰ: ٣/ ١٢٩، ١٣٠

سوال:

آج کل بعض انگریزی تجارتوں کا یہ حال ہے کہ کاغذ [آگے چل کر معلوم ہوگا کہ یہ کاغذ درحقیقت بیع اور سمسرہ کی سند ہے] فروخت کرتے ہیں۔ [یہ عقد اول ہے اور آنے والی تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ کئی وجوہ[1] سے فاسد ہے] اور اس میں چار ٹکٹ لگے ہوتے ہیں جس کو وہ شخص اسی قیمت کو مثلاً ایک روپیہ پر چار اشخاص کے ہاتھ فروخت کرڈالتا ہے [یہ دوسرا عقد ہوا جو سمسرہ فاسدہ[2] پر مشتمل ہے] اور ان اشخاص سے وہ روپیہ وصول کر کے اور ان کا پتا کمپنی کو لکھ کر بھیج دیتا ہے، صاحبِ کمپنی ایک گھڑی اس شخص کو بھیجتا ہے اور ان چار اشخاص کے نام ایک ایک کاغذ ویسا ہی بھیج دیتا ہے جس میں ویسے ہی چار ٹکٹ بھی ہوتے ہیں جس کو وہ چاروں شخص لوگوں کے ہاتھ اسی قیمت کو مثلاً ایک روپیہ کو پھر بیچ ڈالتے ہیں۔ جب روپیہ ان لوگوں کے پاس آجاتا ہے تو وہ لوگ بھی صاحبِ کمپنی کے نام روپیہ اور جن کے ہاتھ وہ ٹکٹ فروخت کیے ہیں ان کا پتا وغیرہ لکھ کر بھیج دیتے ہیں، صاحب کمپنی ایک ایک گھڑی ان کے نام بھیج دیتا ہے، اور ایک ایک کاغذ ویسا ہی جن کے نام انہوں نے ٹکٹ فروخت کیے ہیں صاحبِ کمپنی بھیج دیتا ہے پھر وہ لوگ ویسا ہی عمل کرتے ہیں اور اسی طرح اس کا اجرا رہتا ہے۔ [گویا یہ سیئہ جاریہ ہے] ہاں البتہ جس شخص کے ٹکٹ فروخت نہ ہوں وہ البتہ نقصان اُٹھائے

۱- وہ وجوہ یہ ہیں: (۱) اشتراط تسليم المبيع بشرط فاسد.

(۲) تعليق الثمن على الخطر.

(۳) اشتراط صفقة فى صفقة بل اشتراط صفقة فاسدة فى صفقة فاسدة.

۲- یہ سمسرہ ان وجوہ سے فاسد ہے:

(۱) اجارہ بشرط عدم الأجرة، اس لیے کہ گھڑی تو مبیع بن چکی ہے، پس سمسرۃ بغیر اجرت کے رہا۔ نیز جس کام کے لیے اجیر بنایا جارہا ہے وہ بذات خود غلط ہے۔

(۲) اجارہ فاسدہ مشروط فی البیع الفاسد کہ جب تک گھڑی نہ خریدے گا سمسار نہ بنایا جائے گا اور گھڑی کی خریداری اور سمسار بنانا دونوں فی نفسہ بھی فاسد ہیں۔

گا۔[یہ عقد ثالث قمار ہے لتعلیق الثمن علی الخطر] تو شرعاً یہ بیع جائز ہے یا نہیں؟ اور شرعاً ایسا کرنا کیسا ہے؟[1]

الجواب:

حاصل حقیقت اس معاملہ کا یہ ہے کہ [یہ نکتۃ الغور کی تعیین ہورہی ہے] بائع مشتری اول سے بلاواسطہ اور دوسرے مشتریوں سے بواسطۂ مشتری اول یا ثانی یا ثالث وغیرہم کے یہ معاہدہ کرتا ہے کہ تم نے جو روپیہ بھیجا ہے اگر تم اتنے خریدار پیدا کرلو تو اس روپیہ مرسلہ کے عوض ہم نے تمہارے ہاتھ گھڑی فروخت کردی [یہ پہلی شرط فاسد ہوئی] ورنہ تمہارا روپیہ ہم ضبط کرلیں گے [یہ دوسری شرط فاسد ہوئی] سو اس میں دونوں شرطیں فاسد و باطل ہیں دوسرے خریداروں کے پیدا کرنے کی تقدیر پر فروخت کرنا بھی کہ وہ تنجیز بیع کے وقت [مقرون بشرط مخالف مقتضائے عقد ہونے کی وجہ سے] عقد فاسد بحکم ربٰو ہے اور تعلیق کے وقت [تعلیق الملک علی الخطر ہونے کی وجہ سے] قمار ہے، اور ربٰو اور قمار دونوں حرام ہیں۔ اسی طرح دوسری شرط یعنی خریدار پیدا نہ کرنے کی تقدیر پر روپیہ کا ضبط ہوجانا

۱- غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے میں بنیادی عقد دو ہیں: بیع اور سمسرہ اور یہ دونوں فاسد ہیں۔ بیع تو اس لیے کہ تسلیم مبیع (گھڑی) مشروط ہے چار گاہک لانے کے ساتھ یعنی سمسرہ بدون اجر کے ساتھ، نیز چار گاہک نہ لانے پر ثمن ضبط ہوجائے گا، یہ دونوں شرطیں فاسد ہیں۔ پہلی شرط صفقہ فی صفقہ بلکہ صفقۂ فاسدہ فی صفقہ فاسدہ ہے اور دوسری قمار ہے۔ سمسرہ اس لیے فاسد ہے کہ اس میں اجر کچھ نہیں، گھڑی تو پہلے عقد کی معقود علیہ ہے اور اجارہ میں اجر نہ دینے کی شرط لگانا فاسد ہے۔

اس معاملے میں تیسرا مفسد عنصر قمار ہے کہ ثمن کو داؤ پر لگا دیا جاتا ہے۔ چوتھا مفسدہ یہ ہے کہ یہ سیئہ جاریہ اور معصیت متعدیہ ہے، جتنے لوگ اس میں مبتلا ہوں گے سب کا گناہ اس کی گردن پر ہوگا۔ اس وجہ سے حضرت قدس سرہ نے اس پر تاکیدی ردّ فرمایا اور جواز کی ممکنہ تاویل کا جواب خود سے دے کر مکمل سد باب فرمایا۔

بھی کہ صریح اکل بالباطل ہے۔ [یہ اصل حکم ہوا۔آگے جواز کی ممکنہ تاویل کا ابطال شروع ہورہا ہے] اور یہ تاویل ہرگز مقبول نہیں ہوسکتی کہ روپیہ کے عوض ٹکٹ دیا ہے کیونکہ ٹکٹ یقیناً مبیع نہیں ہے، ورنہ بعد خرید ٹکٹ معاملہ ختم ہوجاتا، ٹکٹ فروخت کرکے گھڑی کا استحقاق ہرگز نہ ہوتا، جیسا کہ تمام عقود میں یہی ہوتا ہے۔ پس صاف ظاہر ہے کہ ٹکٹ مبیع نہیں بلکہ روپیہ کی رسید ہے۔

جب دونوں شرطوں کا فاسدو باطل ہونا ثابت ہوگیا تو ایسا معاملہ بھی بالیقین حرام اور متضمن ربا وقمار واکل بالباطل ہے [یہ الفاظ، تغلیظ کے لیے ہیں] اور کسی طرح اس میں جواز کی گنجائش نہیں [یہ منع کی تاکید ہے؛ لاقتضاء المقام ذلك، آگے تاکید منع کے لیے آیت، حدیث اور فقہ کے حوالے بالترتیب دیے جارہے ہیں]

قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿أحل اللّٰه البيع وحرم الربوا﴾ وقال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿إنما الخمر والميسر إلى قوله: رجس من عمل الشيطان﴾ الآية وقال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿ولا تاكلو أموالكم بينكم بالباطل﴾ الآية

وقال صلى اللّٰه عليه وسلم: "كل شرط ليس فى كتاب اللّٰه فهو باطل". و"نهى عليه السلام عن بيع وشرط".

وفى جميع الكتب الفقهيه صرحوا بعدم جواز بيع مشروط بما لا يقتضيه العقد ولا يلائمه، وفيه نفع لأحدهما، كمالايخفى على من طالعها، والله أعلم.(١)

اپنی رائے کو متہم سمجھیے:

مسائلِ جدیدہ میں اپنی تحقیق پر جلد مطمئن ہونا نہایت مضر ومہلک ہے۔ ایسے مواقع میں دوسرے حضرات سے رجوع، اجتماعی غور وفکر کا اہتمام یا کم از کم سائل کو دوسرے مفتیانِ کرام سے رجوع کا مشورہ دینا لازم ہے، مثلاً: آج کل اجتماعی قربانی میں قصابوں کو

١- امداد الفتاویٰ: ٣/٨٩، ٩٠

اجرت پر رکھا جاتا ہے اور ان سے کچھ رقم زرِ ضمانت کے طور پر پیشگی لی جاتی ہے کہ اگر مقررہ وقت کے اندر جانور ذبح نہ کیے تو یہ رقم ضبط کرلی جائے گی۔

اب ظاہر ہے کہ یہ تعزیر مالی ہے جو جائز نہیں، لیکن قصابوں کی بدمعاملگی کے سدّ باب کے لیے ضروری ہے کہ کوئی ایسی صورت تجویز کی جائے جو انہیں معاہدہ پر عمل کرنے کا پابند بنائے، لہٰذا مفتی کو چاہیے کہ وہ اس صورت کا حکم بتانے کے ساتھ ساتھ کسی متبادل صورت پر غور وفکر کرے اور اپنے اکابر یا ہم عصر مفتیان کرام سے اس کی تصحیح وتصویب کروائے، جیسے: ایک صورت یہ ممکن ہے کہ قصابوں سے یوں معاملہ طے کیا جائے کہ اگر تم نے مقررہ وقت پر کام کردیا تو اجرت معیاری شرح سے دی جائے گی، اگر تاخیر کی تو اجرت کم ملے گی، مثلا: بروقت کام مکمل کیا تو فی جانور ہزار روپے، اگر سُستی کی تو فی جانور آٹھ سو روپے، یہ فقہی اصطلاح میں " ترديد الأجر بترديد الزمان" ہے، امام صاحب کے نزدیک اس میں شرط اول جائز ہوتی ہے اور شرط ثانی فاسد، صاحبین کے نزدیک دونوں جائز ہوتی ہیں۔ (رد المحتار، كتاب الإجارة: جلد٦ / ٧٢)

تعزیر مالی اور اس میں فرق یہ ہوگا کہ جرمانے کے طور پر تو تھوڑی سی سستی پر کوئی بھی رقم یا پورا زرضمانت ضبط ہوسکتا ہے۔ اس صورت میں فقط اتنی کمی ہوگی جو تاخیری اجرت کی صورت میں طے ہوگئی۔

ضرورت عامہ متیقنہ کے وقت اس طرح کے مسائل میں ایسے قول پر فتویٰ دینے پر غور کیا جاسکتا ہے جس سے عوام کی مشکلات کا حل ہوسکیں، لیکن ضروری ہے کہ ایسے مسائل میں اجتماعی غور کیا جائے یا اپنی تحقیق لکھنے کے بعد اکابر حضرات کو دکھالی جائے۔

مکرر سوال کا جواب:

جس مسئلہ کا ایک مرتبہ جواب لکھا جا چکا ہو اگر وہ دوبارہ پوچھا جائے اور یاد آجائے کہ یہ سوال دوبارہ پوچھا جا رہا ہے تو یوں لکھ دیا جائے: "اس استفتاء کا جواب یہاں سے ایک مرتبہ جا چکا ہے، اگر دوبارہ لکھوانا ہے تو پہلا جواب واپس بھیج دیا جائے تب دوسرا جواب ملے گا، ورنہ کہیں اور رجوع کریں"۔ دوبارہ جواب دینے میں یہ ضرر ہے کہ اگر دونوں جوابوں میں اختلاف ہو گیا تو سائل کو زبانِ طعن دراز کرنے کا موقع ہاتھ آجاتا ہے۔[1]

غیر سائل کو جواب کی فراہمی:

ایک سائل کے پوچھے گئے سوال کے جواب کی نقل دوسرا شخص حاصل کرنا چاہے تو اس کی غرضِ صحیح کا ظنِ غالب ہوئے بغیر اسے نقل فراہم نہ کریں۔

۱- تحفۃ العلماء: ۲/ ۲۹۲

تمرینِ فتویٰ

سوال کا انتخاب:

تمرینِ افتاء میں سب سے پہلا مرحلہ سوال کا انتخاب ہے، اس میں مندرجہ ذیل باتوں کا اہتمام ضروری ہے:

(الف) سال اول میں ابتداءً آسان استفتاء لیا جائے۔ اگر سوال ایسا ہو جس میں کوئی جزئیہ مل سکتا ہو تو وہ سب سے بہتر ہے۔ ہاں ہر وقت آسان اور جزئیہ والے استفتاء ہی ملنا ضروری نہیں، اس لیے اساتذۂ کرام کے مشورے سے دوسرا استفتاء بھی لیا جاسکتا ہے۔

(ب) ہر قسم کے موضوع کے استفتاء لے کر حل کرنے کی کوشش ہونی چاہیے۔ صرف ایک ہی موضوع، مثلاً: نماز یا زکوۃ یا چند مخصوص موضوعات والے سوالات لینے سے صحیح تمرین نہ ہو سکے گی جو آگے چل کر مشکل کا سبب ہوگی۔

(ج) استفتاء لینے سے قبل اس کا رجسٹر میں اندراج ضروری ہے تاکہ ضرورت پڑنے پر تلاش کیا جاسکے۔ ہر استفتاء پر اندراج نمبر ہوگا، رجسٹر میں مجیب کا نام، مستفتی کا نام اور اندراج نمبر کے ساتھ وصولی کی تاریخ ہوگی، اسی طرح حل کرنے کے بعد جمع کروا کر واپسی کی تاریخ درج کرلی جائے اور مناسب معلوم ہو تو جوابی لفافے پر ایسی علامت لگائیں جس سے خلط کا امکان باقی نہ رہے، ورنہ کسی کا جواب دوسرے کے لفافے میں جانے کا خطرہ ہے۔

حل استفتاء کی چار بنیادیں:

استفتاء کے حل کے لیے چار کام بالترتیب کیے جاتے ہیں:

(۱) تجزیہ وتحلیل

(۲) تنقیح وتہذیب

(۳) نکتۃ الغور کی تعیین

(٤) مراجع ومظان کا انتخاب اوران سے صحیح استنباط

جواب کی صحت ان امور اربعہ کو صحیح صحیح انجام دینے پر موقوف ہے، لہٰذا اس میں پوری جانفشانی اور ہمت وچستی سے کام لیں۔اس کا طریقۂ متداولہ یہ ہے:

۞ استفتاء لینے کے بعد مراجعتِ کتب سے پہلے اسے کئی بار اچھی طرح غور سے پڑھیں، پھراس کے بعد:

۱- سوال کی اچھی طرح تجزی کریں، امور مسئولہ اصلیہ وضمنیہ کو الگ الگ کریں، یہ تجزیہ وتحلیل ہے۔

۲- کوئی چیز مبہم یا نامکمل ہوتو مستفتی سے پوچھ کر اسے واضح اور مکمل کریں، یہ تنقیح وتہذیب ہے۔

۳-اہم اور بنیادی نکات کو مشخص کریں، بہتر ہے کہ انہیں خط کشیدہ کردیں، یہ نکتۃ الغور کی تعیین ہے۔

مستفتی نے کئی باتوں کو بے ترتیب جمع کیا ہوتا ہے، ان کی طرف التفات کی بجائے نبض کو سمجھنا اور اجزائے سوال کو عقلی منطقی ترتیب دے کر ان میں سے اصل امر مسئول تک پہنچنا جس پر سوال کی عمارت کھڑی ہے اور جس کے حل ہونے پر جواب موقوف ہے، تمرین میں اصل ہے۔نکتۃ الغور کی تعیین سے یہی مراد ہے۔فقہی تکییف کا لفظ بھی اس کے قریب قریب معنی پر بولا جاتا ہے۔

٤- اس کے بعد مظانِ مسئلہ سے مراجعت شروع کریں اور فہم سلیم اور استنباط صحیح کو بروئے کار لاتے ہوئے عبارات کی درست تطبیق کریں۔

کم از کم تین مرتبہ:

جس طرح مدرس کو چاہیے کہ سبق کی تیاری کے لیے تین مرتبہ مطالعہ کرے: پہلی بار فہم کیلئے، دوسری بار افہام کے لیے اور تیسری مرتبہ تسہیل افہام کے لیے، اسی طرح مفتی کو چاہیے کہ سوال کو تین مرتبہ پڑھے:

۱) پہلی مرتبہ تجزیہ وتحلیل کر کے سوال کے مختلف اجزا کو سمجھے۔ اصل اور ضمنی امور مسئولہ کی صحیح صحیح تعیین کرے اور تنقیح وتہذیب کر کے سوال کے اہم نکات کو خط کشیدہ کرے۔

۲) دوسری مرتبہ اس مرکزی نکتہ کو سمجھنے کی کوشش کرے جو اصل امر مسئول ہے اور اس پر سارے سوال کا مدار ہے۔

۳) پھر جب مراجع ومظان میں مسئلہ سے متعلق عبارات تلاش کر لے اور سوال میں پوچھی گئی باتوں پر ان کی تطبیق کر چکے تو جواب کی عبارت سوال کے اسلوب کے مطابق ترتیب دینے اور اس کو آسان الفاظ میں ڈھالنے کے لیے ایک مرتبہ اور سوال کا مطالعہ کرے۔

حقیقت خارجیہ کی جستجو:

فتویٰ حکم شرعی کے بیان کو کہتے ہیں اور حکم شرعی حقیقت خارجیہ پر لاگو ہوتا ہے، لہٰذا اگر امر مسئول کے متعلق خارجی حقائق معلوم کرنے کی ضرورت محسوس ہو تو "معرفة كل شئ عند أهله" کے قاعدہ کے تحت اس چیز یا معاملے کی حقیقت ان افراد سے معلوم کی جائے جو اس فن سے وابستہ ہوں اور اس میں مہارت رکھتے ہوں۔

۞ سوالات کے موضوعات بے شمار ہوتے ہیں، اور مفتی کے وسائل محدود، ایسا ممکن نہیں کہ ہر چیز اسے اپنے پاس دستیاب ہو سکے، محدود وسائل میں رہتے ہوئے معیاری تحقیق کا طریقہ یہ ہے کہ وسائل جہاں موجود ہیں وہیں پہنچ کر ان سے استفادہ کیا جائے اور مطلوبہ معلومات جس فن سے تعلق رکھتی ہیں اس کے ماہر افراد سے "حقیقۃ الامر" دریافت کی جائے۔

طبی امر کی تحقیق ڈاکٹروں سے کی جائے اور تجارتی معاملے کی دکانداروں سے، بیمہ کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے بیمہ دفتر جایا جائے اور آڑھتیوں کے معاملات سمجھنے کے لیے منڈی میں۔امام محمد رحمہ اللہ تعالی کی مثال ہمارے سامنے ہے،وہ بازار میں آمدورفت اور تاجروں کے ساتھ نشست وبرخاست رکھتے تھے[۱] تاکہ ان کے درمیان رائج عقود کی حقیقت علی وجہ البصیرۃ معلوم کرسکیں۔کسی نے ان سے اتنی محنت کرنے اور عامیوں کے پاس اٹھنے بیٹھنے کی مشقت برداشت کرنے کا سبب پوچھا تو فرمایا:

”ایسے شخص سے کیا پوچھتے ہو جس کی گردن کو لوگوں نے جنت وجہنم کے درمیان پل بنا رکھا ہے اور اس پر اعتماد کر کے گزرتے چلے جارہے ہیں“۔

تمرین کا معیاری طریقہ:

جواب لکھنے کا معیاری طریقہ یہ نہیں کہ آپ استفتاء پڑھتے ہی جھٹ کسی جزئیہ کی تلاش میں لگ جائیں۔[۲] افتاء کے باب میں اصل الاصول یہ ہے کہ سوال میں پوچھے گئے امر کی حقیقت کو سمجھیں،سوال کا تجزیہ وتحلیل اور تنقیح وتہذیب کر کے نکتۃ الغور منقح کریں، پھر اس پر عبارات فقہیہ ،صریحی ہوں یا استنباطی،صحیح طور سے منطبق کریں۔اس طرز عمل کے مطابق مشق کرنے سے رفتہ رفتہ افتاء کی اہلیت اور ملکہ فقہیہ پیدا ہو جاتا ہے،اس کے بغیر کثیر تعداد میں فتاوی لکھنے کے

۱- قال فی مناقب الکردریّ: ”وذکر السمعانی عن البویطی عن الشافعی ......“وعن الحسن بن شهوب، قال: رأیت محمدا یذهب إلی الصباغین ویسأل عن معاملاتهم ومایدیرونها فی مابینهم“. (مناقب أبی حنیفة لحافظ الدین الکردری: ٤٢٤، دارالکتاب)

۲- یحرم التساهل فی الفتوی، ومن عرف به حرم استفتاءه، فمن التساهل أن لایتثبت، ویسرع بالفتویٰ قبل استیفاء حقها من النظر والفکر، وإن تقدمت معرفته بالمسؤل عنه فلا بأس بالمبادرة، وعلی هذا یحمل ما نقل عن الماضین من مبادرة. (مقدمةالمجموع: ٤٦)

لیتأمل الرقعة تأملا شافیاً، وآخرها آکد؛ فإن السؤال فی آخرها، وقد یتقید الجمیع بکلمة فی آخرها ویغفل عنها، قال الصیمری: قال بعض العلماء: ینبغی أن یکون توقفه فی المسألة السهلة کالصعبة؛ لیعتاده، وکان محمد بن الحسن یفعله. (المصدر السابق: ٤٨)

باوجود کامیابی کی ضمانت نہیں، مثلاً:

ایک شخص نے سوال کیا کہ زید نے شادی کی، اس سے لڑکی پیدا ہوئی، اس کی شادی کروائی تو نواسی پیدا ہوئی، اس کو ایک شخص سے بیاہ دیا، بعدازاں زید نے دوسری شادی کی، یہ بیوی فوت ہوگئی، پھر زید نے تیسرا نکاح کیا، اس سے ایک لڑکی پیدا ہوئی، لڑکی جب جوان ہوئی تو زید اس کا نکاح بھی اپنے پہلے داماد (نواسی کے شوہر) سے کرنا چاہتا ہے، آیا یہ نکاح ہوسکتا ہے یا نہیں؟

اگر یہ صورت مسئلہ آپ کتابوں میں تلاش کرنا شروع کریں تو ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا، کیونکہ فقہاء علام الغیب نہ تھے کہ قیامت تک کی تمام صورتوں کو صراحتاً لکھ دیتے، اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آپ پہلے اس مسئلہ کی حقیقت سمجھیں، پھر فقہی عبارات میں اس کا حکم تلاش کریں۔

اس معاملہ کی حقیقت یہ ہے کہ ایک شخص دو عورتوں کو نکاح میں جمع کرنا چاہتا ہے اور یہ دو عورتیں آپس میں باپ شریک خالہ اور بھانجی ہیں، اب آپ باب المحرمات میں یہ مسئلہ تلاش کریں کہ خالہ (حقیقی یا علّی یا خیفی) اور بھانجی کو نکاح میں جمع کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ بآسانی آپ مطلوبہ عبارت تلاش کرلیں گے۔

اس بنیادی نکتے کو ایک اور مثال سے سمجھیں:

ایک شخص نے کوئی چیز پاکستانی روپے (مثلاً) دس ہزار میں خریدی، مالک کو اس نے روپیہ دینے کی بجائے ڈالر کا چیک دیا، مالک نے چیک وصول کرکے بینک سے رابطہ کیا تو اس نے جواب دیا کہ اس اکاؤنٹ میں ڈالر موجود نہیں، مالک نے خریدار سے رابطہ کرکے رقم کا مطالبہ کیا، اس عرصے میں چیک میں درج ڈالر کی قیمت دس ہزار سے بڑھ گئی، اب خریدار کہتا ہے کہ اتنے ڈالر ادا کرو جو تم نے روپے کے بدلے میں دینے منظور کیے تھے اور مالک دس ہزار روپے پر اصرار کرتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ بھی آپ کو کسی کتاب میں صراحتاً نہیں مل سکتا، ہاں اگر تمرینِ افتاء کے صحیح طرز کو اپنا کر غور کیا جائے تو بآسانی اسے حل کیا جاسکتا ہے۔

سب سے پہلے ان دونوں کے درمیان کیے گئے معاملے کو فقہی اصطلاحات کی رُو سے سمجھیں۔روپے کے بدلے ڈالر کے چیک پر فریقین کا رضامند ہونا ایک ورقِ نقدی کا دوسرے ورقِ نقدی کی سند کے ساتھ تبادلہ ہے، گویا کہ روپے کی بیع ڈالر کے ساتھ ہوئی، روپے موجود نہیں، واجب فی الذمہ ہیں اور ڈالر بھی موجود نہیں، وہ بینک میں ہیں، وہاں سے بطور حوالہ وصولی کی تحریر (یعنی چیک) خریدار لکھ کر دے رہا ہے۔یہ ''بیع الدین بالدین'' ہوئی جو کہ ناجائز ہے،للنھی عن بیع الکالئ بالکالئ ، لہٰذا یہ معاملہ اصل سے فاسد ہے،خریدار پر عقد کے مطابق روپے کی ادائیگی واجب ہے۔

اس سوال کا جواب تو ختم ہو گیا، لیکن اگر بطور مشق کے سوال کے بقیہ حصے کی تخریج کرنا چاہیں تو وہ یوں ہوگی کہ بالفرض روپے کے ڈالر سے تبادلہ کی یہ صورت جائز ہوتی تو خریدار کا چیک دینا دینِ ثمن کا حوالہ ہے بینک پر، بینک میں رکھی گئی رقم قرض کی حیثیت رکھتی ہے، گویا خریدار نے اپنے اوپر واجب الاداء دین (ثمن) کو اپنے مقروض (بینک) پر حوالہ کر دیا۔بینک کا چیک کی ادائیگی سے انکار دین کا ''توی'' ہے ''توی'' کی صورت میں محتال لہ، محیل پر رجوع کر سکتا ہے،لہٰذا بینک کا انکار سن کر مالک دوبارہ خریدار سے مطالبہ کر سکتا ہے اور یہ مطالبہ ڈالر کا ہوگا، روپیہ کا نہیں، کیونکہ مشتری کا حق روپیہ سے ڈالر میں تبدیل ہو چکا تھا،علی مافرضناہ.

اب آپ چاہیں تو اوپر ذکر کردہ فقہی مسائل کا حوالہ کتب فقہ سے دیکھ کر لکھ سکتے ہیں یعنی ''بیع الدین بالدین'' کا ناجائز ہونا، اپنے مقروض پر دین کا حوالہ درست ہونا،محتال علیہ سے دین کی وصولی نہ ہو سکنے کی صورت میں دوبارہ محیل پر رجوع کرنا وغیرہ۔

لیکن اگر آپ عقد کی حقیقت کو سمجھے بغیر چھوٹتے ہی کسی جزئیہ کی تلاش شروع کر دیتے تو سہل چیز کے حصول کے لیے ایسا مشکل راستہ اختیار کرتے جس سے منزل تک پہنچنا ازبس دشوار ہے۔

خلاصہ یہ کہ استفتاء کے بنظر غائر مطالعہ کے بعد نکتۃ الغور کی تعیین اور حقائق خارجہ سے صحیح

صحیح واقفیت پہلے ہوتی ہے اور مراجعتِ کتب اس کے بعد کی جاتی ہے، تب عبارت یا جزئیہ مل جاتا ہے۔ براہ راست تتبعِ کتب سے بعینہ صورت مسئولہ تلاش نہیں کی جاتی۔

حل استفتاء کے مذکورہ بالا طریقے کے متعلق فقہاء نے فرمایا ہے:

”والغالب أن عدم وجدانه النص لقلة اطلاعه أو عدم معرفته بموضع المسألة المذكورة فيه؛ إذ قل ما تقع حادثة إلاولها ذكر فى كتب المذهب، إما بعينها أو بذكر قاعدة تشملها“.(١)

”ومالا يجده منقولا، إن وجد فى المنقول معناه، بحيث يدرك بغير كبير فكرأنه لا فرق بينهما، جاز إلحاقه به والفتوى به، وكذا ما يعلم اندراجه تحت ضابط ممهّدفى المذهب، وما ليس كذلك يجب إمساكه عن الفتوى فيه. ومثل هذا يقع نادراًفي حق المذكور؛ إذيبعد - كما قال إمام الحرمين- ”أن تقع مسألة لم ينصّ عليهافي المذهب ولا هى فى معنى المنصوص، ولا مندرجة تحت ضابط“.(٢)

جزئیات کی تلاش:

یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہے کہ اصولوں سے بے دھڑک جوابات کی بجائے جزئیات تلاش کرنے کی حتی الامکان کوشش کرنی چاہیے۔ اس کے لیے فقہی کتب اور ان کے مصنفین کے اسلوب و مزاج سے واقفیت نہایت ضروری ہے، اس لیے وقتاً فوقتاً کتب خانہ میں جا کر مختلف کتبِ فقہ وفتاویٰ کا مطالعہ کرتے رہیں۔ ایک مرتبہ جس کتاب کو ہاتھ میں لیں، اس سے عمومی اور جامع واقفیت حاصل کرنے کے بعد ہی اس کو رکھیں۔ یہ عادت وسعت مطالعہ میں اصل ہے۔

کتابوں سے مراجعت دلجمعی اور مستقل مزاجی کا کام ہے اس میں پوری ”جِدّ“ صرف کرنے کے بعد ہی ”لم أجده“ کا قول معتبر ہوتا ہے۔

١- شرح عقود رسم المفتى:٣٤

٢- المجموع شرح المهذب:١/ ٤٤

کلیات سے جواب:

تلاش بسیار کے بعد بھی صریح جزئیہ نہ ملے اور جواب کلیات سے دیا ہو تو آخر میں لکھ دیں: "یہ جواب کلیات سے دیا ہے (یا قواعد کو سامنے رکھ کر دیا ہے) کوئی صریح جزئیہ نہیں ملا، لہٰذا دوسرے حضرات سے بھی رجوع کرلیا جائے"۔[1] ذیل کی مثالیں دیکھیے:

سوال:

اگر کوئی شخص بیدار ہوا اور اس کو خواب یاد ہے، پس حالتِ بیداری میں اس کے بستر پر سے اٹھنے سے پہلے بیدار ہونے کے دو یا تین منٹ بعد اس کو تری معلوم ہوئی جس کو وہ مذی سمجھتا ہے تو اس پر یہ خیال کر کے شاید یہ منی رک گئی ہو جواب نکلی ہے، غسل واجب ہوگا یا اس کو خیال نہیں کرنا چاہیے، بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ دفق وشہوت سے نکلی ہے یا کس طرح؟

الجواب:

جزئیہ تو دیکھا نہیں گیا مگر قواعد سے غسل واجب ہونا چاہیے، کیونکہ خواب کا یاد ہونا علامت اس کی ہے یہ یا منی ہے یا مذی اور دونوں کا احتمالی خروج موجب غسل ہے اور دفق وشہوت کی شرط ہونے کا یہ مطلب ہے کہ انفصال عن المقر کے وقت شہوت ہو، گو خروج کے وقت نہ ہو اور اگر کوئی عارض مانع نہ ہو تو دفق بھی ہو اور یہاں ممکن ہے کہ انفصال کے وقت شہوت ہو اور دفعتاً آنکھ کھلنے سے رک گئی ہو مگر احتیاطاً یہ مسئلہ کہیں اور بھی پوچھ لیا جائے۔[2]

سوال:

رسائل ماہواری جو ارسال ہوا کرتے ہیں وہ اگر ڈاک میں ضائع ہو جاویں تو مشتری بائع سے دوبارہ طلب کرسکتا ہے یا نہیں؟ شرعی حکم اس باب میں کیا ہے؟

۱- دیکھیے: تحفۃ العلماء: ۲/ ۲۶۳ اور اس کی مثال کے لیے ملاحظہ ہو، امداد الفتاویٰ: ۱/۲۵

۲- امداد الفتاوی: ۱/ ۲۵

جواب:

پورا شرح صدر تو ہے نہیں، لیکن قواعد سے رجحان اس طرف ہے کہ دوبارہ طلب کرسکتا ہے۔ لأن الظاهر أن عملة البوسطة وكلاء للبائع لا للمشري، فليراجع إلى العلماء الآخرين، فقط.[1]

کلیات سے سوال:

سائل اگر کلیات سے سوال کرے، مثلا: کسی شخص نے اپنی ساس کو شہوت سے چھولیا، کیا حکم ہے؟ تو جواب میں لکھ دیں: "کلیات سے سوال کرنا اصول کے خلاف ہے، جزئیات ظاہر کرکے پوری بات لکھو، پھر جواب معلوم کرو"۔ ایسے شخص کو ہرگز کلی حکم نہ بتائیں، نہ جانے کہاں منطبق کرے پھر اگر وہ صورتِ مسئلہ بتادے تو بطورِ احتیاط جواب کے آغاز میں ان الفاظ کے ساتھ پیش بندی کریں: "اگر سوال میں لکھی گئی بات واقعہ کے مطابق ہے تو......"

مراجع ومظان*:

سوال کی تنقیح وتہذیب، تحلیل وتجزیہ اور نکتۃ الغور کی تعیین کے بعد کتب سے مراجعت کی باری آتی ہے۔ مراجعت کرتے وقت ایک آدھ کتاب دیکھ کر جواب لکھنا ٹھیک نہیں ہے، بلکہ کئی کتابیں دیکھ کر جواب لکھا جائے۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ ایک سے زیادہ کتب سے مراجعت میں مسئلہ کے ہر پہلو سے آشنائی حاصل ہوگی اور اس کے ساتھ ساتھ کئی اور مسائل بھی نظر سے گذر جائیں گے جو وسعتِ مطالعہ کی کلید اور بوقت ضرورت بہت مفید سرمایہ ہیں، البتہ حوالہ ایک کا نقل کردینا کافی ہے۔

۞ حل استفتاء کے بعد اردو فتاوی سے اس غرض سے رجوع کیا جاسکتا ہے کہ معلوم ہوسکے۔ اکابر نے ایسے استفتاء کے جواب میں کیا تحریر فرمایا ہے اور ناقل کی تحریر میں ان کی تحریرات سے کتنا بُعد ہے؟ خاص طور پر امداد الفتاویٰ، امداد المفتین، امداد الاحکام، احسن الفتاویٰ،

۱- امداد الفتاوی: ۱۳۸/۳

*مراجع وہ کتب ہیں جو مسائل کا ماخذ ہوتی ہیں اور مظان سے مراد ان کتابوں میں وہ جگہ جہاں مسئلہ ملنے کا گمان ہو۔

خیر الفتاویٰ، اور جواہر الفقہ کی مراجعت ہونی چاہیے۔

۞ اردو فتاویٰ سے بعینہ انہی کے الفاظ سے استفادہ خود فریبی ہے، اس سے کبھی بھی فتویٰ لکھنے کی استعداد پیدا نہیں ہوگی۔ ہاں اگر کسی مسئلے میں یہ دیکھنا ہو کہ اکابر نے کیا لکھا ہے اور پھر اس سے اخذ کی ضرورت پڑ جائے تو کوشش کی جائے کہ کم از کم الفاظ اپنے ہوں، تاکہ منقولہ مضمون کی صحیح تعبیر کی اہلیت پیدا ہو سکے اور اگر انہی الفاظ کا نقل کرنا ضروری ہو تو واوین میں نقل کیا جائے تاکہ باقی عبارت سے ممتاز ہو۔

۞ معمول ہے کہ ایسے مسائل جن میں اشتباہ والتباس ہو یا ان میں اپنے موقف کی تائید وتقویت مقصود ہو تو اکابر کے فتاویٰ کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے۔

۞ عربی حوالہ دیتے وقت اردو فتاویٰ کے حوالوں پر ہرگز اکتفاء نہ کریں، بلکہ اصل کتاب کی طرف مراجعت کر کے جلد اور صفحات لکھیں۔ اگر تتبع کے باوجود ماخذ اصلی دستیاب نہ ہو تو اس بات کے اظہار کے لیے کہ اصل ماخذ تک رسائی ممکن نہ ہو سکی، ماخذ ثانوی سے حوالہ دیا جا رہا ہے "بحوالہ فلاں کتاب" کی قید لکھی جاتی ہے۔

لاأدری کی ڈھال:

۞ اگر مسئلہ باوجود کوشش کے نہ ملے تو صاف کہہ دیں کہ مجھے یہ مسئلہ معلوم نہ ہو سکا، آپ دوسرے حضرات سے پوچھ لیں۔ جواب صرف اس صورت میں دیں جب اپنی تحقیق، مسئلہ کی تخریج اور جواب کی صحت پر پورا یقین ہو جائے کہ وہ ایسے ہی ہے جیسا آپ نے سمجھا ہے۔ بغیر تحقیق کے مسئلہ بتانا ناجائز وحرام ہے۔ مسئلہ نہ آتا ہو تو اس کے لیے "لاأدری" کا قانون ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

"إذا لم يقل العالم لاأدري، فقد أصيبت مقاتله[1]"

۱- وقال الشافعي: سمعت مالكا يقول: سمعت ابن عجلان يقول: إذا أغفل العالم لاأدري أصيبت مقاتله، وذكره ابن عجلان عن ابن عباس رضي الله عنهما. (إعلام الموقعين: ۱۸۶/۲)

یعنی جب کسی عالم کو مسئلہ معلوم نہیں تھا اور اس نے اس پر "لاأدری" نہیں کہا اور اٹکل سے جواب دے دیا تو اس پر شیطان و نفس کی ایسی ضرب لگی ہے گویا اسے قتل ہی کر دیا۔ "مقاتل" ان اعضا کو کہتے ہیں جن پر ضرب لگنے کے بعد انسان زندہ نہ رہ سکے۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے بھی ایسی ہی روایت ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ فرمایا کرتے تھے: "جُنة العالم: لاأدری، إذا أغفله أصیبت مقاتله" یعنی "لاأدری" عالم کی ڈھال ہے، اس کے ذریعہ اخروی ہلاکت سے بچ سکتا ہے، جس مسئلہ میں ذرا سا بھی شبہ ہو، اس میں صاف کہہ دیا کہ "لاأدری" تو بچ گیا اور اگر "لاأدری" نہیں کہا تو خطرناک چوٹ کھائی جو ہلاک کر سکتی ہے۔ ایک دفعہ ان سے اڑتالیس (٤٨) مسئلے پوچھے گئے، ان میں سے بتیس (٣٢) میں آپ نے فرمایا: "لاأدری" یعنی ایک تہائی کا جواب دے دیا اور "دو تہائی" کے متعلق فرمایا "لاأدری" اور ایک روایت ہے کہ آپ سے ایک مرتبہ چالیس (٤٠) مسئلے پوچھے گئے، آپ نے صرف پانچ (٥) (یعنی صرف آٹھویں حصے) کا جواب دیا، بقیہ کے بارے میں فرمایا: "لاأدری".

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "لاأدری نصف العلم" یعنی آدھا علم "لاأدری" میں ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کا تو نصف سے زیادہ علم اسی میں تھا۔ اگرچہ یہ کہنا کہ یہ مسئلہ مجھے معلوم نہیں، نفس پر بہت گراں ہے، لیکن آخرت کی فکر اور انجام کا استحضار ہو تو یہ کچھ بھی مشکل نہیں۔ اس میں جو ذلت معلوم ہوتی ہے اسے اللہ تعالیٰ عزت سے بدل دیتے ہیں۔ سائل بھی آئندہ کے لیے ایسے مفتی پر زیادہ اعتماد کرنے لگتا ہے کہ فلاں مفتی صاحب جو مسئلہ بتاتے ہیں، اس کی ان کو پوری تحقیق ہوتی ہے ورنہ نہیں بتاتے، لہٰذا جو کچھ وہ بتائیں وہ قابل اعتماد ہے۔

بے جا اصرار نہ کیجیے:

کبھی اپنی بات کی پچ[1] نہیں کرنی چاہیے۔ ہمارے اکابر بلکہ علمائے اہلسنت والجماعت

١- پچ: تعصب، ضد، جانبداری، فداری۔

کے تمام فقہائے کرام کا طرۂ امتیاز رہا ہے کہ وہ اپنی بات پر بے جا اصرار اور اس کا غیر ضروری دفاع نہیں کرتے تھے۔ یہ حضرات علمی غرور انانیت اور بات کی پچ سے بہت دور تھے۔ وہ اتنے اعلیٰ ظرف ہوا کرتے تھے کہ ایک ادنیٰ طالب علم ان کی کسی بات پر کوئی اعتراض کردے تو نہ صرف یہ کہ اس کو توجہ کے ساتھ سنتے تھے، بلکہ اگر سمجھ میں آجائے تو فوراً قبول فرمالیتے تھے اور اپنی بات سے رجوع بھی کرلیتے تھے۔

چنانچہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمۃ نے "امداد الفتاویٰ" میں "حوادث الفتاویٰ" کے ساتھ ساتھ "ترجیح الراجح" کا بھی ایک سلسلہ شروع کررکھا تھا، چنانچہ اگر کسی عالم نے کسی مسئلہ میں ان کی کسی غلطی کی طرف توجہ دلائی اور حضرت کی رائے تبدیل ہوگئی تو صرف یہی نہیں کہ ان کو خط لکھ دیا کہ میں نے رجوع کرلیا ہے، بلکہ اس کو "ترجیح الراجح" میں شائع کردیا جاتا تھا کہ میں نے پہلے اس مسئلہ کا جواب لکھ دیا تھا، فلاں صاحب کے توجہ دلانے پر یا بعض حضرات کے توجہ دلانے سے اب میری رائے یوں ہوگئی ہے اور میں پچھلے قول سے رجوع کرتا ہوں، اب میرا فتویٰ یہ ہے....

اس میں کبھی ان حضرات نے نہ کوئی شرم محسوس کی اور نہ ہی کسی دوسرے نے ان کے درجہ میں کمی محسوس کی، بلکہ ان کے اس اعتراف نے ان کی عظمت میں اضافہ کیا ہے۔ مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فتاویٰ کے مجموعہ "امداد المفتین" میں ایک مستقل باب قائم کیا تھا: "اختیار الصواب لمختلف الأبواب" یعنی اگر کسی مسئلہ میں ان کی رائے تبدیل ہوجاتی تو رجوع فرماکر اس باب میں شائع فرمادیتے تھے۔ اس زمانہ میں ہمارے بزرگوں کی یہ سنت مردہ ہوتی جارہی ہے۔ کسی کے قلم سے اگر ایک فتویٰ نکل گیا تو اب یہ بہت کم رہ گیا ہے کہ توجہ دلانے پر اور خطا ظاہر ہونے پر رجوع کرلیں۔ اگرچہ الحمدللہ ایسے حضرات علمائے حق موجود ہیں جن کے سامنے اگر ان کے معارض دلائل آجائیں تو رجوع

بھی کرنے میں تامل نہ ہوگا، لیکن اب ایسے حضرات شاذ و نادر ہیں، ورنہ ہر ایک اس کوشش میں رہتا ہے کہ میرے قلم سے جو بات نکلی ہے اس کو منوایا جائے۔ یہ بہت خطرناک عادت ہے۔[1]

مذاہب اربعہ کے اصل ماخذ:

مفتی کے لیے یہ تو ضروری ہے کہ اپنے امام کی فقہ کے مطابق فتویٰ دے، لیکن اس کی سوچ کا وسیع ہونا، احکام کی علل و دلائل پر گہری نظر ہونا، مسائل کے استنباط کا ملکہ ہونا اور دوسرے مذاہب کی تحقیقات سے واقف ہونا بھی ضروری ہے۔ دوسرے مذاہب کی تحقیقات سے واقفیت کے لیے "الفقه المقارن" پر مبنی کتب مثلاً: "بداية المجتهد"، "المغنی"، "المدونة الكبرى"، "الفقة الإسلامی وأدلته" دیکھا کریں۔ یہ کتب مذاہب اربعہ کے اقوال نقل کرتی ہیں، لیکن جب کسی فقہ کا مسئلہ لینا ہو تو اس کی اپنی بنیادی کتب دیکھنا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں فقہ شافعی کے لیے "نهاية المحتاج" للرملی، "مغنی المحتاج" للخطيب اور "شرح المهذب" للنووی تین کتابیں اصل ہیں۔ فقہ مالکی کے لیے "شرح مختصر الخليل" پر دسوقی کا حاشیہ، "شرح دردير" کا حاشیہ اور "حاشية الحطاب" جس کا نام "الموهب الجليل" ہے، بنیادیں ہیں۔ حنبلی مذہب کے لیے "كشاف القناع" اور بہوتی کی "شرح منتهى الإرادات" بہت اچھی ہیں۔[2]

حکم کی تحلیل کیا کریں:

سوچ میں وسعت پیدا کرنے کا نسخہ یہ ہے کہ درج بالا کتب کا گہری نظر سے مطالعہ کریں۔ نیز حکم کی تحلیل بھی کیا کریں، یعنی وہ شرع منزّل ہے یا شرع مؤوّل؟ قطعی ہے یا ظنّی؟ منصوص ہے یا مستنبط؟ متفق علیہ ہے یا مختلف فیہ؟ منقول من الکتاب والسنۃ ہے یا معقول مجتہد فیہ؟ اگر منقول ہے تو کس سے ثابت ہے؟ اور اس کا کیا درجہ ہے؟ اگر معقول ہے تو مجتہد کا قول ہے یا

١- ماخوذ از جدید فقہی مباحث: ٢/ ٣٢، ٣٣

٢- ان کتابوں کے نام مفکر اسلام شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے ایک مجلس میں ارشاد فرمائے۔

بعد کے ائمہ کا؟ اور کس اصل سے ماخوذ ہے؟ نیز وہ اصل، کتاب وسنت میں مذکور ہے یا نفس اصل ہی ماخوذ ومستنبط ہے؟ پھر اس کی معقولیت اب بھی باقی ہے یا صرف اسی زمانے کے رائج فلسفہ یا مزاج کے تابع تھی؟ لیکن ایسا کرتے ہوئے غایتِ احتیاط، تمام ائمہ مجتہدین کا انتہائی ادب و احترام اور ان سے عقیدت ومحبت کا پاس رکھنا نہایت ضروری ہے۔

اعتدال ضروری ہے:

جدید مسائل میں غور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ راہ اعتدال اپنائی جائے، نہ ایسا جمود ہو کہ کتاب وسنت کی نصوص اور فقہاء ومجتہدین کی تحقیقات کو ایک ہی درجہ دے دیا جائے، نہ ایسا تجدد ہو کہ ہر نئی بات کو قبول کر لیا جائے۔ اس بارے میں افراط وتفریط سے بچنا نہایت ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کتاب وسنت کی قائم کی ہوئی حدوں سے آگے بڑھ جائیں یا شریعت کی حدود سے تجاوز کر کے تجدّد واباحیت کے راستے کھول دیں کہ دین میں تصحیف اکبر الکبائر ہے اور ایسا بھی نہ ہو کہ بدلے ہوئے حالات واقدار، تغیر پذیر عرف وعادات اور تبدیل شدہ نظام واطوار سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ہر جزئیہ میں متقدمین کے اجتہادات واستنباطات اور ان کے عہد کے حالات پر مبنی احکام ومسائل اور فتاویٰ پر بلاضرورت اصرار وجمود ہو۔[1] اس طرز عمل سے عام لوگوں میں دین سے بد دلی اور بے دینی کی طرف میلان پیدا ہوگا، سلف نے فرمایا ہے: "من جهل بأهل زمانه فهو جاهل" اس لیے مفتی کو یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ جہاں دین کے مسلّمات کے دائرے سے نکلنا اور سلف صالحین کے اجتہادات کو نظر انداز کرنا ناقابل عفو گمراہی ہے، وہیں فقہی جزئیات پر جمود، شریعت کے مصالح ومقاصد سے بے خبری اور اس کی روح سے بے اعتنائی ہے، جو پہلے امر سے قباحت میں زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں۔

۱- اس جمود کی کئی وجوہ ہوتی ہیں مثلاً: عبارات فقہاء کے ظاہر کو دیکھنا اور اس کی روح سے قطع نظر کرنا، علت وحکمت کا فرق نہ سمجھنا، شرع منزّل اور شرعِ مؤوّل میں فرق نہ کرنا، یعنی اس بات کا لحاظ نہ کرنا کہ حکم منصوص ہے یا مستنبط؟ قطعی ہے یا ظنی؟ متفق علیہ ہے یا مجتہد فیہ؟

اجتماعی مسائل میں مشاورت ناگزیر ہے:

ایسے اجتماعی مسائل جو پوری امت کو درپیش ہیں یا ملک کے تمام مسلمانوں کو درپیش ہیں ان میں انفرادی فتویٰ نہیں دینا چاہیے۔ان میں مفتیان کرام کی باہمی مشاورت نہایت ضروری ہے۔

حکم نبوی:

حدّثنا أحمد ، قال: ناشباب العصفری، نانوح بن قیس عن الولیدبن صالح عن محمد بن الحنفیة، عن علی قال: "قلت: یا رسول الله ! إن نزل بناأمرلیس فیه بیان أمر ولانهی، فماتأمرنا؟ قال:تشاورون الفقهاء والعابدین،ولاتمضوافیه رأی خاصة".[1]

آثار صحابہ:

محمد قال : أخبرنا أبوحنیفة عن الهیثم عن الشعبی قال: "کان ستة من أصحاب النبیّ صلّی الله علیه وسلم یتذاکرون الفقه، منهم :علی بن أبی طالب ، وأبیّ، وأبوموسٰی علی حدة ؛ وعمر، و زید ، وابن مسعود رضی الله عنهم".[2]

یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی دو جماعتیں الگ الگ فقہی مسائل کا مذاکرہ اوران پر اجتماعی غور کرتی تھیں۔ایک میں حضرت علی، حضرت اُبی بن کعب اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم تھے اور دوسری کے شرکا یہ تھے: حضرت عمر، حضرت زید بن ثابت اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم اجمعین۔

طریقۂ تابعین:

وقال علی بن الحسن العسقلانی عن ابن المبارک : "کان فقهاء أهل المدینة سبعة..... قال و کانوا إذا جأتهم المسألة دخلوا فیها جمیعًا، فنظروا فیها، ولا یقضی القاضی حتّی یرفع إلیهم فینظرون فیها فیصدرون".[3]

١- المعجم الأوسط: ١/ ٤٤١

٢- کتاب الآثار : ١٩٠، إدارة القرآن

٣- تهذیب التّهذیب:٢٤٩/٣، تذکرة سالم بن عبد الله

طرزِ مجتہدین:

نقل العلامةالطحطاوی فی حاشیته علی "الدر المختار" عن مسند الخوارزمی عن سیف الأئمة السابلی، مانصه:"أن أبا حنیفة رحمه اللّٰه تعالیٰ تلمّذ لأربعة آلاف من شیوخ أئمةالتابعین وتفقه عند أربعة آلاف، فلم یفت بلسانة ولا بقلمه حتی أمروه، فجلس فی مجلس فی جامع الکوفة، فاجتمع معه ألف من أصحابه أجلهم وأفضلهم أربعون قد بلغوا حد الاجتهاد، فقربهم وأدناهم وقال لهم: "أنتم أجلة أصحابی، ومسارّقلبی، وجلاء أحزانی، وإنی ألجمت هذا الفقه وأسرجته لکم فأعینونی؛ فإن الناس قد جعلونی جسراً علی النار، فإن المنتهی لغیری والعبّ علی ظهری".

فکان رحمه اللّٰه إذا وقعت واقعة شاورهم، وناظرهم، وحاورهم، وسألهم، فیسمع ماعندهم من الأخبار والآثار، ویقول ماعنده، ویناظرونه شهراً أوأکثر حتی یستقر آخر الأقوال، فیثبته أبویوسف، حتی أثبت الأصول علی هذا المنهاج شوری، لا أنه تفرد بذلك کغیره من الأئمة". (۱)

سنتِ اسلاف:

سلطان اورنگ زیب عالمگیر رحمہ اللہ نے اپنے زمانے میں نو پیدا شدہ مسائل کے حل اور قانونی دستور کی تدوین کے لیے علمائے کرام کی ایک جماعت کا تقرر کیا جس نے فتاوی عالمگیریہ کی شکل میں عظیم الشان فقہی ذخیرہ مرتب کیا۔

سلطنت عثمانیہ کی زیر سرپرستی اسلامی قوانین کی تدوین کے لیے اہل علم کی ایک جماعت نے کام کیا جس میں شامی رحمہ اللہ کے فرزند علامہ علاؤالدین رحمہ اللہ بھی شامل تھے۔ اس

۱- ۲/۱/٤٨

جماعت نے ''مجلة الأحکام العدلیة'' کے نام سے مجموعۂ قوانین کی تدوین کی۔

عمل اکابر:

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے ستم رسیدہ عورتوں کی مشکلات کا فقہی حل تلاش کرنے کے لیے متعدد حضرات کو "الحیلة الناجزة" کی ترتیب کے لیے مقرر فرمایا، حضرت مفتی محمد شفیع صاحب اور مولانا مفتی عبدالکریم گمتھلوی رحمہما اللہ ان میں شامل تھے۔ اس میں کئی مسائل میں فقہ مالکی پر فتویٰ دیا گیا ہے، لیکن اس فتوی کو اس وقت تک شائع نہیں کیا گیا جب تک ہندوستان کے تمام ارباب افتاء سے مراجعت نہیں ہوگی اور اصحاب افتاء کی آراء اور تنقیدیں حاصل نہیں ہوگئیں۔ حرمین شریفین کے فقہاء سے خط و کتابت ہوئی۔ ان تمام مراحل کے بعد اس کو کتابی شکل میں شائع کرایا گیا۔ پاکستان میں بھی مفتی اعظم پاکستان حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ اور حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ نے ایک مجلس قائم کر رکھی تھی جو آج بھی "مجلسِ تحقیقِ مسائل حاضرہ" کے نام سے موجود ہے۔ اس مجلس کی طرف سے کئی رسائل شائع ہوئے۔ ایک ایک مسئلہ پر بعض اوقات دو دو سال تک تحقیق ہوتی رہی۔ سعودی عرب میں "مجمع الفقه الاسلامی" اور ہندوستان میں ''اسلامک فقہ اکیڈمی'' فقہی مسائل کے حل کے لیے اجتماعی غور و فکر کی بہترین مثالیں ہیں۔

تحریرِ فتویٰ

جواب پہلے سادہ کاغذ پر لکھا جائے، اس کو "اصلاح اول" کہتے ہیں، پھر اساتذہ کی منظوری کے بعد اصل پر نقل کیا جائے، اس کو "اصلاح دوم" کہتے ہیں۔

اصلاح لکھتے وقت ذیل میں دیے گئے آداب ملحوظ رہیں:

اصلاحِ اول:

۞ اصلاح اوّل میں سطروں کے بیچ اور دونوں جانب مناسب جگہ چھوڑ دیں تاکہ اساتذۂ کرام مطلوبہ اصلاح بسہولت کرسکیں۔

۞ اپنے طور پر فتویٰ میں لکھے گئے حکم کے دلائل (نصّاً ہوں یا استدلالاً) خوب تلاش کریں اور ان میں سے "الأهم فالأهم" کو اصلاح اول میں لکھیں بھی، لیکن اصل پر صرف اس قدر حوالے لکھیں جتنے لابدّی ہوں۔ جس طرح ایک مدرس اپنے طور پر مسئلے کے مالہ وماعلیہ اور مکمل پس منظر سمجھنے کے لیے کئی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے، لیکن طلبہ کے سامنے اتنا بیان کرتا ہے جو نفس کتاب کے حل میں مددگار ہو، کبھی کسی خاص مناسبت سے کوئی اہم خارجی بات بھی بیان کردیتا ہے۔ یہی فرق اصلاح اول ودوم میں ہے۔

اصلاح اول میں آپ مسئلہ کے ہر پہلو کو سامنے رکھ کر تحقیق درج کرسکتے ہیں، ایک سے زیادہ متعلقہ عبارات لکھ سکتے ہیں، چاہے مطلب صراحتاً ثابت ہو رہا ہو یا دلالتاً، لیکن اصلاح دوم میں وہی کچھ لکھیں جو اصلاح دیکھنے والے اساتذہ نے باقی رہنے دیا ہو۔ ان کی طرف سے کی گئی قطع وبرید کا حتمی مطلب تغلیط نہیں ہوگا، تہذیب کے پیش نظر بھی وہ عبارات کو کم کرتے ہیں، اس سے پست حوصلہ نہ ہونا چاہیے۔

۞ اصلاح اول کے آخر میں مسئلہ کا عنوان اور سلسلۃ الجواب لکھیں۔ مسئلے کا عنوان "نکتۃ الغور" کا دوسرا نام ہے۔اس کے لیے جامع، مانع اور مختصر الفاظ چنے جاتے ہیں۔اوراس کا اسلوب یہ ہوتا ہے کہ کبھی جملہ خبریہ کی شکل میں، کبھی جملہ استفہامیہ کی صورت میں اور کبھی شبہ جملہ کی تعبیر اختیار کی جاتی ہے۔

اصلاح دوم:

۞ اصلاح دوم میں صاف اور خوشخط لکھنے کی پوری کوشش ہو۔حرف پورے پورے اوران کی شکل ٹھیک ٹھیک ہو،دندانے اور شوشے پورے ہوں، نقطے ٹھیک جگہ لگے ہوئے ہوں۔ نیز خط متوسط ہو، نہ بہت موٹا ہو نہ بہت باریک،حروف نہ بہت ملے ہوئے ہوں نہ بہت دور دور۔ایک جواب میں ایک ہی قلم اور خط استعمال کرنا چاہیے،ایک ہی صفحے میں دو الگ قلم یا خط نہ ہونے چاہییں۔

(۱) إن النبی صلی اللّٰه علیه وسلّم قال لمعاویة رضی اللّٰه عنه – و کان کاتبه یکتب بینه وبین العرب – : "لُقِ الدواة، وحرّف القلم،وانصب الباء، وفرق السین، ولا تُعور المیم، وحسّن اللّٰه، ومد الرحمن، وجوّد الرحیم، وضَعْ قلمك علی أذنك الیسریٰ؛فإنه أذکرلك".

"قوله : "لُقِ الدواة" بضم اللام و کسر القاف، مخففة الأمر من لُقتُه ألُوقه، تقول: لُقتُ الدواة إذا أصلحت مدادها.

"قوله: حرّف القلم" أمر من التحریف أی اجعل القلم محرّفاً.

ترجمہ:" حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا(حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ آپ کے کاتب تھے):"دوات کی سیاہی اچھی بناؤ، قلم پر ترچھا قط لگاؤ،"ب"کو بڑا کرو،سین کے دندانوں کو واضح کرو،میم کی آنکھ نہ پھوڑو، "اللہ"کو خوبصورت لکھو، "رحمٰن"کو (یعنی اس کے نون کو)دراز کرو،" الرحیم"کو خوب اچھی طرح لکھو،قلم کو اپنے بائیں کان پر رکھو،ایسا

کرنے سے تمہیں بات خوب یادرہے گی[1]"۔

(۲) عن يزيد بن حبيب: "أن كاتب عمرو بن العاص رضي الله عنه كتب إلى عمر رضي الله عنه، فكتب بسم الله،ولم يكتب لها سيناً، فضربه عمر، فقيل له:فيم ضربك أمير المؤمنين؟ قال: ضربني في سين......"[2]

(۳) روى عن الإمام أبي حنيفة رحمه الله أنه رأى كاتباً يقرمط في الكتابة، فقال: "لم تقرمط خطك؟ إن عشت تندم،وإن مت تشتم".

قوله: "يقرمط في الكتابة" أي يدققها ويصغرها، وقوله:"إن عشت تندم" أي إذا شخت وضعف بصرك، ندمت على ذلك.

(٤) يكتب الجواب بخط واضح وسط، لادقيق خافّ، ولا غليظ جافّ، ويتوسط في سطورها بين توسيعها وتضييقها، وتكون عبارة واضحة صحيحة، تفهمها العامة ولايزدريها الخاصة، واستحب بعضهم أن لاتختلف أقلامه وخطه؛خوفا من التزوير، ولئلا يشتبه خطه.[3]

۞ اہم "علامات ترقیم" کا پورا پورا اہتمام کیا جائے۔سکتہ (،) ختمہ (۔) اور واوین (" ") کا برمحل استعمال لازمی سمجھیں۔اس سے تحریر خوبصورت اور معیاری ہوتی ہے۔

۞ جہاں سوال کی عبارت ختم ہو، وہیں سے متصل جواب لکھنا شروع کریں۔اگر اسی صفحہ پر جگہ نہیں تو سوال کی پشت پر فاصلہ چھوڑے بغیر جواب لکھیں۔اس میں تزویر (جعل سازی) سے حفاظت ہے۔[4] صفحے کے آخر میں "جاری ہے" یا "ورق الٹیے" لکھیں ۔

۱- نثر المرجان في رسم نظم القرآن:۱/۳۷

۲- الإتقان: ۲/۱۷۰

۳- مقدمة المجموع للإمام النووي: ٤٨

٤- قال ابن الصلاح: "وإذا أجاب على ظهر الرقعة، فينبغي أن يكون الجواب في أعلاها لا في ذيلها، اللهم إلا أن يبتدئ الجواب في أسفلها متصلا بالاستفتاء، فيضيق عليه المواضع، فيمتد ورائها مما يلي أسفلها؛ ليتصل جوابه". (أدب المفتي والمستفتي: ۷۹)

۞ "الجواب حامداً و مصلیاً" وغیرہ درمیان میں لکھا جائے۔

۞ صفحے کے دونوں جانب مناسب حاشیہ چھوڑ کر لکھنا شروع کریں۔

۞ اصلاح دوم میں دائیں طرف نسبتاً زیادہ حاشیہ چھوڑیں تاکہ عکاسی اور جلد بندی میں سہولت رہے۔

۞ پہلی سطر حاشیے سے کم وبیش تین حروف کی جگہ چھوڑ کر لکھیں، بقیہ سطریں حاشیہ کے ساتھ سے شروع کریں۔

۞ ایک بند مکمل ہو جائے تو دوسرا شروع کرتے ہوئے بھی پہلی سطر تقریباً تین حروف کی جگہ چھوڑ کر اور بقیہ سطریں حاشیے سے متصل شروع کریں۔

۞ حوالہ نقل کرتے وقت دونوں جانب اردو عبارت کی بنسبت کچھ زیادہ جگہ چھوڑی جائے اور اس کے شروع و آخر میں واوین لگا کر اسے ممتاز کیا جائے۔ یہی طریقہ ہر اس عبارت میں اپنایا جائے جو بلفظہ نقل کی جائے۔

۞ جواب مکمل ہو جائے تو " فقط واللہ اعلم" لکھیں۔ عقائد اور اصول کے مسائل میں "واللہ الموفق" لکھیں۔[1]

۞ ناقل اپنا نام بھی اسی کے ساتھ یا ایک سطر نیچے لکھے۔

۞ اصل کاغذ پر دہری لکھائی یا کاٹ پیٹ ہرگز نہ ہونی چاہیے۔ کوئی چیز مٹانی ہو تو سلیقے اور صفائی سے سفیدے کے ساتھ مٹائیں۔ اضافہ کرنا ہو تو "علامۃ الالتحاق" بصورت "ذنب السہم" (⅃) استعمال کریں۔

۱- قال الصيمری: ولا يدع ختم جوابه بقوله: وبالله التوفيق أو والله أعلم... قلت: وإذا ختم الجواب بقوله: والله أعلم و نحوه مماسبق، فليكتب بعده: كتبه فلان أوفلان بن فلان الفلانی، فينتسب إلى ما يعرف به من قبيلة أوبلدة أوصفة. (مقدمة المجموع: ٤٩)

۞ اصلاح دوم لکھنے کے بعد اس پر اور توجہ باریک بینی کے ساتھ نظر ثانی کریں۔[1]
سقط فی النقل کی اصلاح خود طالب علم کی ذمہ داری ہے۔

اجزائے فتویٰ

فتویٰ کے عام طور پر تین بنیادی اجزا ہوتے ہیں: تمہید، اصل جواب اور خاتمہ۔

(۱) تمہید:

یہ ہر فتویٰ میں نہیں لکھی جاتی، صرف طویل یا اہم جوابات کے شروع میں ہوتی ہے۔ اس میں آیندہ تحریر کیے جانے والے حکم کا پس منظر یا ایسے فقہی قواعد یا کلّی امور دیے جاتے ہیں جن پر جواب کی تفریع کی گئی ہو۔ کبھی ایسے مقدمات لکھے جاتے ہیں جو جواب کی بنیاد اور دلیل کا کام دیں۔ جب حکم میں کسی قسم کی غرابت وندرت ہو تو اس سے پہلے ایسی تمہید لکھنی چاہیے جس سے حکم کی وضاحت ہو اور جو اس کے لیے مقدمہ بن سکے۔

۱- وإذا كتب الجواب أعاد نظره فيه؛ خوفاً من اختلالٍ وقع فيه، أو إخلال ببعض المسؤل عنه. (مقدمة المجموع :٤٨)

بعض نے نظر ثانی کے ساتھ اپنے اہل علم رفقاء کو پڑھ کر سنانے کی تجویز دی ہے، امام محی الدین نووی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

يستحب أن يقرأها على حاضريه من هو أهل لذلك، ويشاورهم ويباحثهم برفق و إنصاف، وإن كانوا دونه و تلامذته؛ للاقتداء بالسلف ورجاء ظهور ماقد يخفى عليه، إلا أن يكون فيها مايقبح إبداؤه أو يؤثر السائل كتمانه أو فى إشاعته مفسدة. (أيضًا)

(۲) اصل جواب:

یہ سب سے اہم، بنیادی اور مقصودی جز ہے۔ اکثر فتاوی میں صرف اس پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ یہ دو چیزوں پر مشتمل ہوتا ہے: حکم اور دلیل۔

کوشش کی جائے کہ یہ جز عقلی و منطقی انداز میں مرتب ہو۔ حکمِ مسئلہ واضح انداز میں تحریر ہو۔ دلائل و تفصیل میں منطقی ترتیب اور ربط کا خیال رکھا جائے۔ اگر سوال میں کسی بات کے حق میں دلائل دیے گئے ہیں یا اشکالات اٹھائے گئے ہیں تو ان کا جواب بھی مناسب معروضی ترتیب کے ساتھ درج کیا جائے۔

(۳) خاتمہ:

تمہید کی طرح یہ جز بھی صرف طویل یا مخصوص فتاویٰ میں لکھا جاتا ہے، تمام جوابات میں نہیں۔ عمومی طور پر اس کا مضمون یہ ہوتا ہے کہ عقائد سے متعلق سوال کے آخر میں سب مسلمانوں کے لیے ہدایت کی، بدعات ورسوم وغیرہ سے متعلق جواب میں ان سے بچنے کی توفیق نصیب ہونے کی، اور اختلافی مسائل میں صراط مستقیم پر قائم رہنے کی دعا دی جاتی ہے۔ اختلافی مسئلہ ہو تو فریقین کو حکم شرعی مان لینے کی ترغیب دی جاتی ہے، وغیر ذلک۔

اسلوبِ فتویٰ

معتدل اور متوازن عبارت:

فتویٰ کی عبارت معتدل، متوازن اور متناسب ہونی چاہیے۔ اس میں ایجازِ مخل ہو نہ اطنابِ ممل، یعنی حد سے زیادہ اختصار بھی ٹھیک نہیں، کیونکہ تحریر میں کسی قسم کا الجھاؤ یا ابہام قبیح عیب ہے اور ضرورت سے زیادہ تطویل بھی مناسب نہیں، کیونکہ یہ وعظ وتعلیم یا تصنیف وتالیف کا موقع نہیں ہے، الّا یہ کہ کسی اہم مسئلے میں حکام وقت کو توجہ دلانی ہو یا اس کی اہمیت عوام کے دل میں بٹھانی ہو تو مکمل تفصیل ووضاحت میں حرج نہیں۔(۱)

فتویٰ میں مناسب الفاظ کے چناؤ اور بامعنی ومتداول تعبیرات کے انتخاب پر خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ ایسے ٹھیٹھ عالمانہ الفاظ بھی نہ ہوں جن کا مطلب سائل نہ سمجھے اور نہ ایسے عامیانہ ہوں جو ابتذال کی حد میں آتے ہوں۔(۲)

۱- قال ابن الصلاح: "قلت: الاقتصار على لا أو نعم لا يليق بغير العامة، وإنما يحسن بالمفتي الاختصار الذى لايخل بالبيان المشترط عليه، دون مايخل به، فلا يدع إطالة لا يحصل البيان بدونها". (أدب المستفتي:۷۷)

۲- فتویٰ کے لیے خصوصاً اور تقریر وتحریر کے لیے عموماً صرف ایسے الفاظ وتعبیرات استعمال کیے جائیں جو عام فہم اور عوام الناس کی ذہنی سطح کے مطابق ہوں۔ کسی زمانے میں برصغیر کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ مغلیہ سلطنت کے سقوط کے بعد یہ سانحہ ہوا کہ یہاں انگریزی زبان رائج کردی گئی۔ اس کا یہ مہلک نتیجہ سامنے آیا کہ عامۃ المسلمین فارسی وعربی سے دور ہوتے چلے گئے اور اب نوبت یہاں تک آپہنچی ہے کہ علمائے کرام ومفتیان حضرات جن الفاظ کو روزمرّہ کی بول چال میں بلاتکلف استعمال کرتے ہیں، ان کو پڑھے لکھے لوگ بھی نہیں سمجھ پاتے، بلکہ اب تو اردو کے ثقیل الفاظ کے صحیح تلفظ پر قادر افراد بھی کم ہوتے جارہے ہیں، اس لیے عوام الناس کی رعایت کرتے ہوئے "دینی ادب" (تصنیف وتالیف، وعظ وبیان، فتویٰ وتحقیق) میں سادہ اور عوام فہم الفاظ وتراکیب کو رواج دینا چاہیے (اگرچہ اس میں تکلف سے کام لینا پڑے) تاکہ حکم شرعی کے اظہار وابلاغ کی ذمہ داری کما حقہ ادا ہو سکے۔

عام فہم اور آسان زبان:

جواب ہمیشہ عام فہم اور آسان زبان میں تحریر کیا جائے تا کہ مخاطب اسے ٹھیک ٹھیک سمجھ لے اور نتیجے تک پہنچنے میں اسے کوئی دشواری نہ ہو۔ علمی اصطلاحات اور عربی و فارسی تراکیب استعمال نہ کی جائیں۔ پہلے زمانے میں علم دین کا چرچا تھا اور عربی و فارسی علمی زبانوں کے طور پر معروف تھیں اس لیے لوگ علمی و فقہی اصطلاحات سے نامانوس نہ تھے۔ مستفتی خواہ عالم نہ ہو مگر بحیثیت مجموعی مفتی کی مراد ٹھیک ٹھیک سمجھ لیتا تھا۔ اگر خود نہ سمجھتا تو اکثر جگہوں میں ایسے لوگ موجود تھے جو کنز، کافیہ تک پڑھے ہوئے تھے، وہ اسے فتویٰ کا مطلب سمجھا سکتے تھے۔ اب صورت حال ویسی نہیں رہی، اس لیے سائل عامی ہو تو جواب کی عبارت اس کی ذہنی سطح کی مناسبت سے عام فہم ہونی چاہیے۔

مثلاً میراث کے مسائل کا جواب دیتے ہوئے عام طور سے مفتی حضرات یہ جملہ لکھتے رہے ہیں:

"مرحوم کا جملہ ترکہ بعد تقدیم حقوق ثلثہ متقدمہ علی الارث حسب ذیل طریقے پر تقسیم ہوگا۔"

اس فارمولے کا مطلب پہلے ہر پڑھے لکھے شخص کو معلوم ہوتا تھا، لیکن اب اگر یہ جملہ کسی گریجویٹ کے سامنے بھی آجائے تو وہ اس کی مراد نہیں سمجھ سکتا اور اس سے میراث کی شرعی تقسیم میں خلل واقع ہو سکتا ہے۔ اول تو آج لوگوں کو یہ بھی احساس نہیں رہا کہ میت کے ترکے میں کیا کیا چیزیں شامل ہوتی ہیں؟ چنانچہ عام طور سے میت کے ذاتی استعمال کی چھوٹی چھوٹی چیزوں بلکہ بعض اوقات گھر کا ساز و سامان تک ترکے کی تقسیم میں شامل نہیں کیا جاتا۔ پھر نہ لوگوں کو "حقوق متقدمہ علی الارث" کا مطلب معلوم ہے اور نہ ان کے مصداق کا پتہ ہے، اس لیے حضرت مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع رحمہ تعالیٰ نے میراث کے مسائل میں اس جملے کے بجائے حسب ذیل طویل عبارت لکھوانی شروع کی تھی:

"صورت مسئولہ میں مرحوم نے جو کچھ نقدی، زیور، جائیداد یا چھوٹا بڑا سامان چھوڑا ہو اس میں سے پہلے مرحوم کی تجہیز و تکفین کے متوسط اخراجات نکالے جائیں، پھر اگر مرحوم کے ذمے کچھ

قرض ہوتو وہ ادا کیا جائے اور بیوی کا مہر اگر ابھی تک ادا نہیں کیا تو وہ قرض میں شامل ہے، اس کو ادا کیا جائے، پھر اگر مرحوم نے کوئی جائز وصیت کسی غیر وارث کے حق میں کی ہو تو ایک تہائی تک اس کے مطابق عمل کیا جائے، اس کے بعد جو ترکہ بچے اسے حسب ذیل تفصیل کے مطابق تقسیم کیا جائے"۔

یہ تو ایک مثال تھی، ورنہ حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے فتویٰ نویسی کے پورے اسلوب میں عام روش سے ہٹ کر ایسا طریقہ اختیار کیا تھا جس سے ایک طرف فتویٰ کی شوکت اور فقہی باریکیاں برقرار رہیں اور دوسری طرف اس کی عبارت میں سلاست اور عام فہمی پیدا ہو جائے۔ چنانچہ جو حضرات آپ سے فتویٰ کی تربیت لیتے، ان کو بھی آپ اس بات کی تاکید فرماتے، اس کی باقاعدہ مشق کراتے اور ان کے عبارت کی اصلاح پر کافی وقت خرچ کرتے تھے۔[1]

سوال کی تان:

سوال کے آخری حصے کو غور سے پڑھ کر دیکھنا چاہیے کہ سوال کی تان کہاں آ کر ٹوٹ رہی ہے۔ پھر اس کے مطابق الفاظ لے کر جواب ڈھالنا چاہیے تا کہ "السؤال معاد فی الجواب" سے استفادہ کرتے ہوئے کم سے کم الفاظ میں مستفتی کی تشفی کی جاسکے۔

معیاری جواب کی خصوصیت:

صحیح اور معیاری جواب کا بنیادی وصف یہ ہے کہ مستفتی کو وہ حکم صاف صاف معلوم ہو جائے جس کے معلوم نہ ہونے کے سبب استفتاء کی ضرورت پیش آئی۔ اگر اس کی الجھن حل نہیں ہوتی اور مفتی اس اس کا جواب پڑھنے کے بعد اسے واضح طور پر معلوم نہیں ہو پاتا کہ اب وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے؟ تو مفتی نے اپنی ذمہ داری پوری نہیں کی۔

قال الإمام أبو عمرو بن الصلاح:" أخبرني الشيخ أبو العباس أحمد بن الحسن المقرى ببغداد ، قال : أنبأنا أبو الحسن علي بن هبة الله بن عبد السلام، قال: أنبأنا الشيخ الإمام أبو إسحاق إبراهيم بن علي الفيروز آبادی ، قال: سمعت شيخنا

۱- البلاغ، مفتی اعظم نمبر: ۱/۳۷۸، ۳۸۸

القاضي أبا الطيب الطبري، قال: سمعت أبا العباس الخضري ، قال: "كنت جالساً عند أبي بكر محمد بن داود الأصبهاني الظاهري، فجاء ته امرأة فقالت له: ما تقول في رجل له زوجة ، لا هو ممسكها، ولا هو مطلّقها؟ فقال أبو بكر : "اختلف في ذلك أهل العلم ، فقال قائلون: تؤمر بالصبر والاحتساب، ويبعث على التطلب والاكتساب، وقال قائلون: يُؤمر بالإِ نفاق، وإلا تحمل على الإطلاق".

فلم تفهم المرأة قوله، فأعادت وقالت :رجل له زوجة ، لا هو ممسكها ولا هو مطلّقها؟ فقال لها:"يا هذه قد أجبتك عن مسألتك، وأرشدتك إلى طلبتك ، ولست بسلطان فَأمْضِي، ولا قاضٍ فأَقْضي، ولا زوج فأرضي، انصرفي". فانصرفتِ المرأةُ، ولم تفهم جوابه.

ولقد وقع ابن داود بعيداً عن مناهج المفتين في تعقيده هذا و تسجيعه ، وتحييره من استر شده.(١)

فتوی نویسی کا بہترین اسلوب:

✿ مفصل فتاوی میں بعض اوقات مسئلے کے احکام، اس کے دلائل اور شبہات کے جوابات اس طرح گڈمڈ ہو جاتے ہیں کہ عام پڑھنے والے کا ذہن الجھ جاتا ہے اور سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے نہ صرف پورا فتویٰ پڑھنا پڑتا ہے بلکہ بعض اوقات پورے فتویٰ کو پڑھ کر بھی بآسانی جواب کا خلاصہ ذہن میں نہیں بیٹھتا، اس لیے فتویٰ میں مسئلے کا مختصر حکم اور اس کے مفصل دلائل بالکل ممتاز ہونے چاہییں تاکہ جو شخص صرف حکم معلوم کرنا چاہتا ہو وہ بآسانی حکم معلوم کر لے اور جس شخص کو دلائل سے دلچسپی ہو وہ دلائل بھی پڑھے۔فتویٰ میں عام آدمی کے لیے تو صرف حکم ہی ہوتا ہے، دلائل اہل علم کے لیے ہوتے ہیں، اس لیے عام آدمی کو فتویٰ کے شروع ہی میں مختصراً یہ بات واضح طور پر معلوم ہو جانی چاہیے کہ جس چیز کے بارے میں سوال کیا گیا ہے اس

١- أدب المفتي والستفتي: ١/ ٧٠

کا مختصر جواب کیا ہے؟ اس جواب کے بعد اہل علم کے لیے دلائل کی تفصیل، حوالے اور شبہات کے جواب جتنی تفصیل سے چاہیں دیدیے جائیں۔

خلاصہ یہ کہ فتویٰ نویسی کا بہترین اسلوب بقول مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ یہ ہے: " پڑھنے والے کو سوال کا جواب تو پہلے ہی لفظ سے مل جائے، پھر کوئی دلائل پڑھنا چاہتا ہے تو پڑھے نہیں پڑھنا چاہتا تو چھوڑ دے۔ نرا حکم معلوم کرنے کے لیے پورا مفصل فتویٰ پڑھنے کی ضرورت نہ پڑے"[1]۔

بعض صورتوں جبکہ جواب میں شقیں زیادہ ہوں تو حکم کو منضبط شکل میں سامنے لانے کے لیے آخر میں خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

۞ سوال کی عبارت کا باریک بینی سے جائزہ لے کر مستفتی کے محتاج الیہ تمام امور کا بالاستیعاب جواب دینا چاہیے تاکہ اسے کسی قسم کی تشنگی نہ رہے اور اعادۂ سوال کی ضرورت نہ پڑے۔

درج ذیل سوال کو پڑھیے:

سوال:

انتقالِ خون کا کیا حکم ہے؟

کوئی شخص اگر بیمار ہو اور ڈاکٹر اس کے لیے خون ضروری قرار دیں تو اسے خون کا عطیہ دینا جائز ہے یا نہیں؟ اور اگر اس میں صدقہ اور ثواب کی نیت کرے تو اجر ملے گا یا نہیں؟ انسان کا خون حرام ہے۔ کیا حرام چیز کو صدقہ کرنے سے ثواب ملتا ہے؟

اس سوال کے جواب میں، عند الضرورۃ انتقالِ خون کا جواز لکھنا کافی نہیں۔ نہ اتنی بات سے سائل کی تشفی ہوگی کہ صحیح نیت سے خون کا عطیہ دینے والے کو اجر ملے گا، بلکہ اس اشکال کی وضاحت بھی ضروری ہوگی کہ حرام چیز کے عطیہ سے ثواب کیسے ملتا ہے؟ لہٰذا آپ کو یہ تیسرا جز بھی حل کرنا ہوگا۔ مثلاً یوں کہنا ہوگا:

۱- البلاغ، مفتی اعظم نمبر: ۳۸۹/۱

خون کا خارجی استعمال حرام ہے۔ داخلی استعمال مثلاً مریض کی جان بچانے کے لیے اس کے جسم میں خون منتقل کرنا حرام نہیں، جائز ہے اور جائز کاموں میں حصول ثواب کی نیت کی جائے تو ثواب ملتا ہے۔

تہہ درتہہ سوال:

سوال بعض اوقات تہہ درتہہ ہوتا ہے اور سوال کرنے والا تمام باتوں کو خلط ملط کر کے پوچھتا ہے۔ ایسے مواقع پر سوال کا تجزیہ وتنقیح کر کے حل طلب امور کو عقلی معروضی ترتیب دے کر لکھ دیا جائے: " اس مسئلے میں یہ باتیں قابل غور ہیں" پھران منقح امور کا ترتیب وار جواب دیا جائے۔

اسلوب الحکیم:

۞ مفتی کے لیے جائز ہے کہ "اسلوب الحکیم" اختیار کرتے ہوئے اصل پوچھی گئی بات کے بجائے جوبات انفع للسائل ہے اسے تحریر کرے۔

قال اللّٰہ تعالی: ﴿ يسألونك ماذا ينفقون؟ قل ما أنفقتم من خير فللوالدين والأقربين واليتمى والمساكين وابن السبيل. ﴾(۱)

مفید اضافات:

۞ یہ بھی درست ہے کہ پوچھی گئی باتوں کے علاوہ حسب موقع وضرورت مفید باتوں کا اضافہ کر دیا جائے، اتباعاً للحديث المعروف : "هو الطهور ماؤه والحل ميتته". امام بخاری نے اپنی صحیح میں باب باندھا ہے: "باب من أجاب السائل بأكثر مما سأله" پھراس میں حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما ذکر کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: ما يلبس المحرم؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:"لا يلبس القميص

۱- البقرة:۲۱۵

ولاالسراويل ولاالبرنس، ولا ثوبا مسّه الورس أو الزعفران، فإن لم يجد النعلين فليلبس الخفين، وليقطعهما حتى يكونا تحت الكعبين"[۱].

مختصر جواب کب مناسب ہے؟

۞ جو مسائل بہت واضح ہیں، محتاج تفصیل نہیں یا اکثر وبیشتر پوچھے جاتے رہتے ہیں، ان میں یجوز، لایجوز یا یناسب، لایناسب جیسے مختصر جواب بھی دیے جاسکتے ہیں[۲]۔

مفتی کی معلومات کے مطابق جواب:

۞ مفتی کو اگر صورت واقعہ کا علم ہے اور سوال میں اصل بات تحریر نہیں کی گئی تو سائل سے اصل صورتحال سوال میں لکھوائے یا خود جواب میں یوں لکھے: "یہ واقعہ چونکہ دراصل یوں

۱- قال الحافظ العسقلانی: قال ابن منير: "موقع هذه الترجمة التنبيه على أن مطابقة الجواب للسوال غير لازم،..... ويؤخذ منه أيضا أن المفتی إذا سئل عن واقعة واحتمل عنده أن يكون السائل يتذرع بجوابه الى أن يعيده الى غير محل السؤال، تعين عليه أن يفصل الجواب، ولهذا قال: "فإن لم يجد النعلين" فكأنه سأكل عن حالة الاختيار فأجابه عنها ومراده حالة الاضطرار، (فتح الباری: ۱/۳۱۱) قال ابن الصلاح: "وإذا زاد المفتی على جواب المذكور فی السؤال ماله به تعلق، ويحتاج إلى التنبيه عليه، فذلك حسن." (أدب المفتی والمستفتی: ۷۹)

۲- ليختصر جوابه ويكون بحيث تفهمه العامة. قال صاحب االحاوی: يقول: يجوز أولا يجوز، أو حق أو باطل، وحكی شيخه الصيمری عن شيخه القاضی أبی حامد أنه كان يختصر غاية مايمكنه، واستفتی فی مسالة اٰخرها: يجوز أم لا؟ فكتب: لا، وبالله التوفيق. (مقدمة المجموع: ٤٩)

لیکن یہ طرز عمل صرف بدیہی اور کثیر السؤال مسائل میں ہونا چاہیے، تفصیل طلب سوالات کا جواب بسط وتفصیل سے دینا مناسب بلکہ بعض اوقات ضروری ہوتا ہے۔

ہے، لہٰذا اس کا جواب یہ ہے.....“۔[۱]

۞ جب قرینے سے معلوم ہو کہ جواب مستفتی کی غرض کے خلاف ہے اور وہ اسے اپنے کاغذ پر لکھا جانا پسند نہیں کرے گا تو زبانی جواب پر اکتفا کرنا مناسب ہے۔[۲]

کسی جانب جھکاؤ شانِ علم کے خلاف ہے:

۞ مفتی کو سائل یا اس کے خصم کی طرف رجحان یا جھکاؤ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ اس رجحان ومیلان کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں، مثلاً یہ کہ ”مالہ“ کو ذکر کردیا جائے ”ماعلیہ“ کو چھوڑ دیا جائے یا فریق مخالف کے دعویٰ کا جواب اور اس سے خلاصی کا طریقہ خود سے بیان کرنا شروع کردیا جائے۔[۳]

تغلیظ فی الجواب:

۞ بعض مسائل میں تغلیظ فی الجواب کی ضرورت ہوتی ہے، ایسے موقع پر مفتی کو موقع کی مناسبت سے تاکیدی الفاظ لکھنے چاہییں، مثلاً: ”یہ مسئلہ قرآن وحدیث کی واضح نصوص اور اجماع امت سے ثابت ہے، اس میں کسی کا اختلاف نہیں“ یا ”فوری علیحدگی فرض ہے، اکٹھے رہنا

۱- قال ابن الصلاح: ”وإذا كان المكتوب في الرقعة، على خلاف الصورة الواقعة، وعلم المفتي بذلك، فليفت على ماوجده في الرقعة، وليقل: ”هذا إذا كان الأمر على ما ذكر، وإن كان كيت وكيت، ويذكر ماعلمه من الصورة، فالحكم كذا وكذا.“ (أدب المفتي والمستفتي: ۷۸،۷۹)

۲- اذا ظهر للمفتي أن الجواب خلاف غرض المستفتي، وأنه لايرضىٰ بكتابته في ورقته، فليقتصر على مشافهته بالجواب. (مقدمة المجموع: ۵۰)

۳- وليحذر أن يميل في فتواه مع المستفتي أو خصمه، ووجوه الميل كثيرة لاتخفى. ومنها أن يكتب في جوابه ماهو له ويترك ماعليه. وليس له أن يبدأ في مسائل الدعوى والبينات بوجوه المخالص منها، وإذا سأله أحدهم وقال: بأي شئ تندفع دعوى كذا وكذا، أوبينة كذا وكذا؟ لم يجبه، كي لايتوصل بذلك إلى إبطال حق، وله أن يسأل عن حاله في ما ادعى عليه، فإذا شرحه له عرفه بما فيه من دافع وغير دافع. (أيضًا)

حرام کاری کا ارتکاب ہے“ وغیرہ وغیرہ۔[1]

شرعی فتویٰ یا انتظامی مشورہ؟

۞ بعض اوقات کسی مسئلے کا ٹھیٹھ فقہی حکم بیان کرنے سے مفاسد کا اندیشہ ہوتا ہے، مثلاً: ایک چیز فی نفسہ مباح ہے لیکن اس کی کھلی چھوٹ دیدینے سے اندیشہ ہے کہ بات معصیت تک پہنچے گی اور لوگ شرعی حدود پر قائم نہیں رہیں گے، ایسے موقع پر مفتی کو یہ بھی مدنظر رکھنا پڑتا ہے کہ اس کام کی حوصلہ افزائی نہ ہو اور دوسری طرف فقہی حکم میں تصرف بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس موقع پر فقہ وفتویٰ کا فرق ملحوظ رکھتے ہوئے نہایت احتیاط، باریک بینی، موقع ومردم شناسی اور معاملہ فہمی کی ضرورت ہوتی ہے۔ حضرت تھانوی قدس سرہ اس بارے میں فرماتے ہیں:

”بہت سے مسائل ایسے ہیں کہ گو فی نفسہ صحیح ہوں مگر مفضی ہوجاتے ہیں مفاسد کی طرف، جہاں عوام کو ان کی اطلاع ہوئی اور آفتیں کھڑی ہوئیں، اس لیے ایسے مسائل نہیں بیان کرنا چاہیے۔ میں نے بہت دفعہ بیان کیا ہے کہ علم دین بعض لوگوں کو مضر ہوتا ہے تو یہاں ضررِ علم سے بچانا مقصود ہے، اس لیے کتمان بھی نہ ہوگا۔ جس مسئلے پر زور دینے میں فتنہ کھڑا ہوتا ہو اس میں گفتگو بند کردی جائے، کیونکہ اس خاص دینی مسئلے کی حمایت کرنے سے فتنہ کا دبانا زیادہ ضروری ہے۔ ہاں مقتدائے اسلام کو شریعت کی ہر بات صاف صاف کہنا چاہیے، جیسے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے

۱- وقد يحتاج المفتي في بعض الوقائع إلى أن يشدد ويبالغ فيقول: وهذا إجماع المسلمين، أو لا أعلم في هذا خلافا، أو فمن خالف هذا فقد خالف الواجب وعدل عن الصواب، أو فقد أثم وفسق، أو على وليّ الأمر أن يأخذ بهذا ولا يهمل الأمر، وما أشبه هذه الألفاظ على حسب ما تقتضيه المصلحة وتوجبه الحال. (مقدمة المجموع: ۵۲)

بعض حضرات سے ایسے موقع پر ایسا ذومعنی جواب منقول ہے جس کی صحیح تاویل ہوسکے۔ علامہ نووی رحمہ اللہ مجموع کے مقدمے میں لکھتے ہیں: ”قال الصيمري: إذا رأى المفتي المصلحة أن يفتي العامي بما فيه تغليظ، وهو مما لايعتقد ظاهره وله فيه تاويل، جاز ذلك زجراً له، كما روى عن ابن عباس رضي الله عنهما أنه سئل عن توبة القاتل، فقال: لاتوبة له. وسأله آخر فقال: له توبة، ثم قال: أما الأول فرأيت في عينه إرادة القتل فمنعته، وأما الثاني فجاء مستكينا قد قتل فلم أقنطه.“ (المصدر السابق: ۵۰)

خلقِ قرآن کے متعلق صاف صاف کہہ دیا تھا اور جو ایسا بڑا مقتدا نہ ہو اس کو بحث کی ضرورت نہیں۔ جہاں مخاطب سمجھ دار منصف مزاج ہو وہاں صحیح مسئلہ بیان کر دے اور جہاں بحث مباحثہ کی صورت ہو خاموش رہے"۔

حضرت مفتی اعظم مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالی سے منقول ہے کہ ایسے موقع پر مفتی کو اپنا جواب فتویٰ کی بجائے مشورے کے طور پر لکھنا چاہیے، ایسے موقع پر اس قسم کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں: "فلاں عمل مناسب نہیں یا درست نہیں" یا "اس سے پرہیز کرنا چاہیے"۔[1]

ہر جواب "صورت مسئولہ" کے لفظ سے شروع نہ کریں:

۞ جواب کے شروع میں "صورت مسئولہ" کا لفظ صرف اس وقت لکھا جاتا ہے جب سوال کسی خاص صورت اور حادثہ مخصوصہ کے متعلق ہو، اجتماعی اور عمومی نوعیت کے مسائل میں جو کسی فرد مخصوص یا انفرادی واقعہ سے متعلق نہ ہوں، صورت مسئولہ کا لفظ نہیں لکھا جاتا۔

تزویر کا سدّ باب:

۞ اگر قرائن سے معلوم ہو کہ سائل کی طرف سے غلط بیانی کا احتمال ہے اور حقائق کی تبدیلی سے جواب تبدیل ہوگا تو سوال میں درج امور کی صحت کی ذمہ داری سائل پر ڈالنے کے لیے اور تزویر کے سد باب کے لیے جواب کے شروع میں یوں لکھا جاتا تھا: "بر تقدیر صدق (یا صحت) صورت مسئولہ......" تا کہ مفتی عند اللہ وعند الناس بری ہو جائے۔

لیکن اب یہ الفاظ عامی لوگ نہیں سمجھتے، لہٰذا یوں لکھنا چاہیے:

"اگر سوال میں درج کیے گئے امور واقعہ کے مطابق ہیں تو......"[2]

۱- البلاغ، مفتی اعظم نمبر: ۱/ ۳۸٦

۲- إذا فهم من السؤال صورة وهو يحتمل غيرها، فلينهر عليها في أوّل جوابه فيقول: إن كان قد قال كذا و كذا أو فعل كذا و كذا، أو ماأشبه هذا، ثم يذكر حكم ذلك. والله أعلم. (فتاوى ابن الصلاح: ۱/ ۸۱، ۸۲)

زیادہ اہم مسئلہ یا متنازع فیہ واقعہ کے آخر میں احتیاطاً اس جیسے الفاظ کا اضافہ بھی کر دیتے ہیں:

"یہ جواب سوال میں درج کیے گئے واقعہ/ فراہم کی گئی معلومات کے مطابق لکھا گیا ہے۔ مفتی کو غیب کا علم نہیں ہوتا، اگر حقیقت حال اس کے برخلاف ہو تو اوپر لکھا گیا حکم اس پر لاگو نہ ہوگا"۔

مناسخہ کا سوال:

۞ مناسخہ کے سوال میں جب میتیں زیادہ ہوں اور تصحیح بہت بڑھ جائے تو جواب کو مختصر کرنے کا ایک طریقہ ہے، اس کو اپنانے پر غور کرنا چاہیے۔ وہ یہ ہے کہ آخر میں سو روپے ترکہ فرض کر کے المبلغ پر تقسیم کریں، پھر ہر وارث کو جو کچھ ملے گا وہ اس کا فیصدی حصہ ہوگا۔ آج کل ہر چیز میں اعشاری نظام رائج ہونے کی وجہ سے فیصدی حصہ آسانی سے لوگوں کو سمجھ میں آجاتا ہے، اس لیے میراث سے متعلق سوالوں میں ورثہ کے نام اور حصص کی تفصیل عبارت میں لکھنے کے ساتھ مناسب یہ ہے کہ چار کالم بنائیں۔ پہلے میں نمبر شمار، دوسرے میں وارث کا نام، تیسرے میں ہر ایک کو ملنے والا حصہ اور چوتھے میں فیصدی حصہ لکھیں اور اگر سائل نے ترکہ بتا دیا ہو تو پانچویں کالم کا اضافہ کر کے اس میں ہر وارث کو ملنے والی رقم بھی لکھ دیں، پھر ہر کالم کے نیچے تمام اعداد کو جمع کر کے لکھ دیں۔

عبارات کا اندراج

فتویٰ میں دلیل لکھنی چاہیے یا نہیں؟ اس میں اختلاف چلا آیا ہے۔ راجح یہ ہے کہ (بعض استثنائی سوالات کے علاوہ) دلیل مسئلہ لکھنی چاہیے۔ اس میں کئی فوائد ہیں، منجملہ ان کے یہ کہ اس سے مستفتی کو فہم وبصیرت، اطمینان وایقان نصیب ہوتا ہے، عمل کرنے پر تحریک ملتی ہے، وساوس واوہام ختم اور حیل ومکر زائل ہوجاتے ہیں، اس لیے مناسب ہے کہ مفتی اپنے فتویٰ کو دلیل سے مزیّن کرے۔ آیت یا حدیث ہو تو فبها ونعمت، ورنہ تحقیقات مجتہدین یا عبارات فقہاء..... خصوصاً جب کہ مستفتی کے ذہن میں اشکال ہو اور بغیر دلیل وتعلیل کے وہ مطمئن ہوتا نظر نہ آتا ہو تو دلیل لکھنی چاہیے۔(۱)

عبارت لکھنے کے دو طریقے:

جواب میں عبارت درج کرنے کے دو طریقے ہیں: پہلا کم استعمال ہوتا ہے دوسرا زیادہ۔

۱- ليس بمنكر أن يذكر المفتي في فتواه الحجة، إذا كانت نصاً واضحاً مختصراً. قال الصيمري: لايذكر الحجة إن أفتى عامياً، ويذكرها إن أفتى فقيهاً، كمن يسئل عن النكاح بلاولي، فحسن أن يقول: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "لانكاح إلا بولي" أو عن رجعة المطلقة بعد الدخول، فيقول: له رجعتها، قال الله تعالىٰ ﴿وبعولتهن أحق بردهن﴾ قال: ولم تجر العادة أن يذكر في فتواه طريق الاجتهاد، ووجهة القياس والاستدلال، إلا أن تتعلق الفتوى بقضاء قرض، فيؤمي فيهاإلى طريق الاجتهاد، ويلوح بالنكتة، وكذا إذا أفتى غيره فيها بغلط، فيفعل ذلك لينبه على ماذهب إليه، ولو كان فيما يفتي به غموض، فحسن أن يلوح بحجته. وقال صاحب الحاوي: لايذكر حجة؛ ليفرق بين الفتيا والتصنيف. قال: ولو ساغ التجاوز إلى قليل لساغ إلى كثير، ولصار المفتي مدرساً. والتفصيل الذي ذكرناه أولى من إطلاق صاحب الحاوي المنع. (مقدمة المجموع: ۵۲)

(۱) کبھی عبارات پہلے لکھی جاتی ہیں اور جواب بعد میں، ان الفاظ کے ساتھ: "درج بالا عبارت سے معلوم ہوتا ہے...۔"

(۲) کبھی جواب پہلے لکھا جاتا ہے اور دلیل بعد میں، ان الفاظ کے ساتھ: "مندرجہ ذیل عبارت سے معلوم ہوتا ہے...۔"

یہ دونوں طریقے قرآن شریف سے ثابت ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿یسألونك عن المحیض، قل هو أذى، فاعتزلوا النساء فی المحیض.﴾ یہاں علتِ اذی کو حکم اعتزال سے پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ ایک دوسری جگہ حکم کو علت پر مقدم رکھا گیا ہے۔ ارشاد باری ہے: ﴿فطلقوهن لعدتهن، وأحصوا العدة.﴾ اس کی علت آگے ذکر کی گئی ہے: ﴿لعل الله یحدث بعد ذلك أمرًا.﴾

دعویٰ اور دلیل میں مطابقت:

عبارات سے مطلوب کا ثبوت جس درجے کا ہو، اسی درجے کے الفاظ لکھنے چاہییں۔ یہ الفاظ ضعف وقوت میں بالترتیب یوں ہیں: "معلوم ہوتا ہے، معلوم ہوا؛ ثابت ہوتا ہے، ثابت ہوا"۔

عقائد سے متعلق مسائل کا حوالہ:

جب سوال اصول دین یا عقائد وقطعیات سے متعلق ہو تو کتاب وسنت سے بھی حوالہ جات دینے چاہییں نہ کہ فقط کتب فقہ سے، اگر فروعی مسائل ہوں تو صرف عبارات فقہ لکھنے میں حرج نہیں۔

طلاق ثلاثہ کا حوالہ:

طلاق ثلاثہ کے مسئلے میں عبارات فقہیہ سے پہلے آیت بقرہ اور بخاری شریف کی حدیث عُسیلہ لکھنی مناسب ہے۔

عبارات کا ترجمہ:

جواب میں آیات واحادیث ہوں تو عامیوں کی رعایت اور فائدہ اس میں ہے کہ ان کا ترجمہ بھی لکھا جائے یا فقط ترجمہ لکھ کر حوالہ لکھ دیا جائے، عربی عبارات وہ سمجھ نہیں سکتے، لہٰذا ان کے

فوائد اور تاثیر سے محروم رہ جاتے ہیں، البتہ فقہی عبارات کے ترجمے کی ان کو ضرورت ہے نہ ان کے سمجھنے کی استعداد، ان کے لکھنے سے استشہاد مقصود ہوتا ہے جو بغیر ترجمہ بھی حاصل ہے، نیز یہ اہل علم کے ملاحظہ کے لیے لکھی جاتی ہیں جن کو ترجمے کی حاجت نہیں۔

مختلف اجزا کا حوالہ:

جواب کے مختلف اجزا حوالہ طلب ہوں تو ہر جز کی اردو عبارت مکمل ہونے پر اس سے متعلق عبارت نقل کرنی چاہیے۔ جواب کے مختلف اجزا کو مسلسل لکھنے پھر آخر میں سب حوالہ جات اکٹھے نقل کرنے سے بسا اوقات عبارت کو اس سے ثابت ہونے والے مدّعیٰ کے ساتھ تطبیق دینے میں مشکل ہوتی ہے۔

لیکن دوسری طرف یہ بات بھی ہے کہ حوالہ جات کے بیچ میں لکھنے جانے سے اردو عبارت کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے اور مستفتی جو کہ عربی نہیں سمجھتا، اس کو مشکل پیش آتی ہے اس لیے اگر اردو عبارت مسلسل لکھنا ہی مناسب معلوم ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک پیرا ختم ہونے پر قوسین میں "للعبارة الأولى الآتية، للعبارة الثانية..." وغیرہ لکھ دیں یا ہر پیرے کے بعد یوں لکھیں: "دیکھیے عبارت نمبر ۱، دیکھیے نمبر ۲ وغیرہ" پھر ہر عبارت پر اعداد ڈال دیں۔

مختلف مراجع سے حوالہ:

اگر فتویٰ ایک حکم پر مشتمل ہو، اس کے اجزا الگ الگ محتاج حوالہ نہ ہوں لیکن مطلوب پر دلالت کرنے والی عبارات مختلف مراجع سے لی جا رہی ہوں تو اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ پہلے پورا جواب لکھ دیں پھر محولہ عبارات کو یوں لکھیں: والحجة على ما قلنا:

(۱) ما في القرآن الكريم: "......" (سورت... آیت...)

(۲) ما في الحديث النبوي: "......" (صحیح... ج... ص...)

(۳) ما في جامع أحكام القرآن "......" (... ج... ص...)

(٤) ما فی فتح البـــاری"......" (...ج...ص...)

(٥) ما فی عمدة القاری"......" (...ج...ص...)

(٦) ما فی التنویر مع الدر المختار"......" (...ج...ص...)

(٧) مـا فی الهنـــدية"......" (...ج...ص...)

حوالہ جات لکھنے میں احتیاط:

☆ جس کتاب کا حوالہ دے رہے ہیں اس کے جلد وصفحہ کے ساتھ مطبع بھی لکھیں اور اگر کتاب کے متعدد نسخے چھپ چکے ہوں تو جلد وصفحہ کے ساتھ باب اور فصل کا بھی اضافہ کریں۔

☆ جب تک مطلوبہ عبارت اصل ماخذ میں نہ دیکھ لیں اس کے مصنف کی طرف منسوب کر کے نقل نہ کریں۔ اگر ماخذ اصلی دستیاب نہ ہو تو ماخذ ثانوی کی طرف سے منسوب کر کے حوالہ نقل کریں، مثلاً: فتاوی ابن الصلاح بحوالۂ المجموع شرح المهذب۔

متفرق باتیں

۞ جزم واحتیاط کو اپنا شعار بنائیں۔سوال کے پیش نظر کے ساتھ اس کے پس منظر اور تہہ منظر کو بھی مدنظر رکھیں۔درست جواب باعث اجر وثواب ہے لیکن غلط مسئلہ بتایا تو اس کا فائدہ مستفتی لے گا لیکن بوجھ اور وبال مفتی کی گردن پر ہوگا۔

۞ مستفتی کی کم فہمی یا درشت مزاجی سے ہونے والی کوفت پر صبر کریں،اس کا اجر اللہ کے یہاں بہت ہے،جیسے حضرت داؤد علیہ الصلاۃ والسلام نے خصمین کے فعل " تسور محراب" اور قول "لا تشطط" پر صبر وتحمل سے کام لیا تھا،حالانکہ وہ بادشاہ وقت بھی تھے۔(۱)

۞ کئی سوال جمع ہوجائیں تو "الأسبق فالأسبق" کی ترتیب سے جواب دینا چاہیے۔اگر سب اکٹھے آئے ہوں یا اسبق معلوم نہ ہو تو قرعہ نکالا جاسکتا ہے۔بغیر ضرورتِ واقعیہ معتبرہ کے کسی مستفتی کو کسی پر ترجیح نہ دینا چاہیے۔(۲)

۱- قال الإمام أبو عمرو بن الصلاح : "إذا كان المستفتي بعيد الفهم، فينبغي للمفتي أن يكون رفيقاً به، صبوراً عليه، حسن التأني في التفهم منه و التفهيم له، حسن الإقبال عليه، لاسيّما إذا كان ضعيف الحال، محتسباً أجر ذلك، فإنه جزيل.
أُخبرت عن أبي الفتوح عبدالوهاب بن شاه النيسابوري، قال: أخبرنا الأستاذ أبو القاسم القشيري قال: سمعت أباسعيد الشحام يقول: رأيت الشيخ الإمام أبا الطيب سهلاً الصعلوكي في المنام، فقلت: أيها الشيخ : فقال: دع التشييخ، فقلت: وتلك الأحوال التي شاهدُتها؟ فقال: لم تُغن عنّا، فقلتُ: مافعل الله بك؟ فقال: غفرلي بمسائل كان يسأل عنها العُجُز. (العجز: بضم العين والجيم: العجائز) والله أعلم.(أدب المفتي والستفتي: ۷۳)

۲- يجب على المفتي عند اجتماع الرقاع بحضرته أن يقدم الأسبق فالأسبق، كما يفعله القاضي في الخصوم، وهذا فيما يجب فيه الإفتاء، فإن تساووا أو جهل السابق قدم بالقرعة، والصحيح أنه يجوز تقديم المرأة والمسافر الذي شدّ رحله وفي تأخيره ضرر بتخلفه عن رفقته ونحو ذلك، إلا إذا كثر المسافرون والنساء بحيث يلحق غيرهم بتقديمهم ضرر كثير، فيعود بالتقديم بالسبق أو القرعة، ثم لايقدم أحدا إلا في فتيا واحدة.(مقدمة المجموع ۵۰)

۞ تحقیق تو خوب کی جائے، مگر اتنی تاخیر نہ ہو کہ مستفتی کی پریشانی کا سبب ہو، بلکہ جواب جلد مکمل کرنے کی پوری کوشش کی جائے۔ واپسی کی تاریخ موعود تک جواب تیار نہ ہو تو اس سے قبل آکر اساتذہ سے مشورہ کریں۔

۞ نیا استفتاء اس وقت تک نہ لیا جائے جب تک پہلا جمع نہ کروادیں۔

۞ اساتذہ کرام بسا اوقات جواب کا کوئی جز یا حوالہ مذکورہ کاٹ دیتے ہیں اور کبھی پورا جواب نامنظور ہوگا، تو اس سے مایوس یا بددل نہ ہونا چاہیے۔ محنت جاری رکھیں، اللہ پاک اپنی رحمت سے آسان فرمائیں گے۔ ایسے مواقع پر درج ذیل دعا کا اہتمام کریں:

"اللهمّ ربّ جبرئيل وميكائيل وإسرافيل، فاطر السموٰت والأرض، عالم الغيب والشهادة! أنت تحكم بين عبادك فيما كانوا فيه يختلفون، اهدني لما اختلف فيه الحق بإذنك، أنت تهدى من تشاء إلى صراط مستقيم". (۱)

نیز کتاب کھولتے یا علمی کام شروع کرتے وقت ان کلمات کے ورد کا معمول بنائیں:

"سبحانك لاعلم لنا إلا ما علمتنا، إنك أنت العليم الحكيم". (۲)

۱- إعلام الموقعين: ۲ / ۲۷۱

۲- روى عن مكحول ومالك رضى الله عنهما أنهما كانا لايفتيان حتى يقولا: لاحول ولاقوة إلا بالله. ونحن نستحب للمفتي مع غيره، فليقل إذا أراد الإفتاء: أعوذ بالله من الشيطان الرجيم، ﴿سبحانك لاعلم لناإلاماعلمتنا، إنك انت العليم الحكيم﴾ ﴿ففهمناها سليمان﴾ ﴿ربّ اشرح لى صدرى، ويسّرلى أمّرى، واحلُل عقدةً من لسانى، يفقهوا قولى﴾ لاحول ولاقوة إلابالله العلى العظيم، سبحانك اللّٰهم وحنانيك، اللهم لاتَنْسَنى ولاتُنَسِّنِى، الحمدللّٰه أفضل الحمد، اللهم صل على محمد وعلى آله وسائر النبيين وسلم، اللهم وفقنى واهدِنى، وسدّدنى، واجمع لى بين الصواب والثواب، وأعِذنى من الخطأ والحرمان. آمين. وإن لم يأت بذلك عند كل فتوى، فليأت به عند أول فُتيا يُفتيها فى يومه، لما يفتيه فى سائر يومه مضيفاً إليه قراءة الفاتحة، وآية الكرسى وما تيسر، فإنّ مَنُ ثابر على ذلك، كان حقيقاً بأن يكون موفقاً فى فتاويه، والله أعلم. (أدب المفتى والمستفتى: ۷۶)

مسئلہ تلاش کرتے وقت "يا معلم إبراهيم! علّمني" کثرت سے پڑھتے رہیں۔

۞ تحقیق کا مزاج پیدا کریں اور کوشش کریں کہ یہ عادت طبیعت میں ایسی رچ بس جائے کہ فطرت ثانیہ بن جائے۔ امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے متعلق منقول ہے کہ وہ راتوں میں کتابوں کے مطالعہ کے عادی تھے۔ موسم گرما میں یہ حال ہوتا کہ کتاب کھلی ہوئی ہے، بدن کا کرتا اترا ہوا ہے اور پانی سے بھرا طشت سامنے ہے۔ جب نیند کا غلبہ ہوتا تو طشت سے پانی لے کر آنکھوں پر چھینٹے دیتے۔ تاکہ یہ غلبہ ختم ہو اور پوری بیداری اور تیقظ کے ساتھ مطالعہ جاری رکھیں اور نئے نئے مسائل کا استخراج واستنباط کریں۔

شب بیداری کے اس مسلسل عمل نے ان کی صحت پر جب مضر اثرات ڈالے تو ایک دن ان کے چند رفقا ان کی خدمت میں آئے اور کہا کہ یوں مسلسل نہ جاگیں، کچھ سویا بھی کریں، ورنہ آپ کی صحت خراب ہوجائے گی۔ رفقا کی اس ہمدردانہ بات کو سننے کے بعد امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے جو جواب دیا وہ لوح قلب پر نقش کرلینا چاہیے، آپ نے فرمایا:

"كيف أنام وقد نامت عيون المسلمين تعويلاً علينا، ويقولون: إذا وقع لنا أمر رفعناه إليه فيكشفه لنا، فإذا نمنافقيه تضييع الدين".[1]

۞ اوقات کی پابندی اور انتھک محنت کی عادت ڈالیں اور اسے اپنا شعار بنائیں۔ حضرت مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ سے حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے متعلق ایک واقعہ روایت کیا ہے۔ علامہ عثمانی رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ جب مرض الموت میں تھے، ہر وقت یہ خطرہ تھا کہ کسی وقت بھی وفات کی خبر آجائے گی، ایک رات تہجد کے وقت دیوبند میں یہی خبر مشہور ہوگئی کہ علامہ کشمیری کی وفات ہوگئی ہے۔ علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں اس وقت بے تاب

۱- بلوغ الأماني في سيرة الإمام محمد بن الحسن الشيباني: للعلامة محمد زاهد الكوثري: ۵۷، ۵۸

ہو کر جلد محلّہ خانقاہ کی طرف حضرت کو دیکھنے کے لیے حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضرت شاہ صاحب دو زانو بیٹھے، کتاب ہاتھ میں لیے لالٹین پر جھکے ہوئے "شامی" کے مطالعہ میں غرق ہیں۔ بہت سخت علالت اور ضعف کا زمانہ تھا میں نے بطور شکایت عرض کیا: " حضرت ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی وہ یہ کہ "شامی" میں کونسا ایسا مسئلہ ہے جس کو آپ نے پہلے نہیں دیکھا اور جو آپ کا دیکھا ہوتا ہے وہ آپ کو یاد بھی ہوتا ہے اور اگر کوئی مسئلہ ایسا تھا کہ جو آپ نے دیکھا نہیں تھا اور آپ کو یاد بھی نہیں تھا تو ہم آپ کے غلام کہاں مر گئے تھے، ہم میں سے کسی کو حکم دیتے وہ مسئلہ نکال کر آپ کی خدمت میں پیش کر دیتا۔ اس تکلیف میں آپ اتنی مشقت اٹھا رہے ہیں؟"

علامہ عثمانی رحمہ اللہ تعالی فرماتے ہیں: حضرت شاہ صاحب مجھے دیکھنے لگے اور فرمایا:

" بھئی! ٹھیک کہتے ہو لیکن یہ کتاب بھی تو اک روگ ہے۔ اس روگ کا کیا کروں؟"

یعنی تحقیق و جستجو اور مطالعہ کی عادت بھی ایک روگ ہے۔ اللہ تعالی سے دعا ہے کہ یہ روگ ہم سب کو لگا دے۔[1]

۞ اتباع سنت اور ترک منکرات کا خوب خوب اہتمام کریں۔ ہمارے اکابر علمی مصروفیات میں حد درجہ منہمک ہونے کے باوجود نفلی عبادات، ذکر و اذکار اور تلاوت و مناجات میں اتنا وقت لگاتے تھے کہ سن کر تعجب ہوتا ہے۔ آپ بھی تقویٰ، اتباع سنت اور طاعات کا نور حاصل کرنے کی جدو جہد کیجیے۔

☆ بداخلاقی، بے مروتی، بے احتیاطی، غفلت اور لا ابالی پن کو قریب نہ پھٹکنے دیجیے کہ یہ عالم کے لیے سخت عیب ہیں۔

حدثنی المثنٰی واحمد بن الحسن الترمذی، قالا: ثنا نعیم بن حماد، قال: ثنا فیاض الرقی، قال: ثنا عبداللہ بن یزید الأودی۔ و کان أدرک اصحاب رسول اللہ صلی

۱- جدید فقہی مباحث: ۲/۲۹

الله علیه وسلم۔ قال: حدثنا أنس ابن مالك وأبو أمامة وأبو الدرداء، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم سئل عن الراسخين في العلم، فقال: "من برت يمينه، وصدق لسانه، واستقام به قلبه، وعف بطنه وفرجه، فذلك الراسخ في العلم"(۱)

☆ ہر طالب علم کی ذاتی بیاض بننا بھی نہایت ضروری ہے، اس کی مدد سے غیر مظان میں درج مسائل کو تلاش کرنا سہل ہو جاتا ہے۔ کتابوں کی مراجعت کے دوران اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی ایک مسئلے کی تلاش میں ورق گردانی کرتا ہے، مطلوبہ مسئلہ ملنے سے پہلے اسے بہت سے دوسرے کارآمد مسائل نظر آجاتے ہیں، لیکن چونکہ اس وقت ان کی ضرورت نہیں ہوتی اس لیے مطلوبہ مسئلے کی تلاش میں ان کو نظر انداز کر کے گذر جاتا ہے، بعد میں جب کبھی ان مسائل کی ضرورت پیش آتی ہے تو یاد کرتا ہے کہ یہ مسئلہ کہیں دیکھا تھا لیکن کیا اور کہاں؟ یہ یاد نہیں آتا۔ ایسی پریشانی سے بچنے اور ان بکھرے ہوئے مسائل کو ضبط کرنے کے لیے افتاء سے متعلق ہر شخص کو اپنی ذاتی بیاض بنانی چاہیے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک خالی "بیاض" لے کر اس کو فقہی ابواب پر مرتب کر کے ہر باب کے عنوان کے تحت اس کی اہمیت اور اس کے تحت آنے والے مسائل کی تعداد کا لحاظ رکھتے ہوئے صفحات خالی چھوڑ دیے جائیں۔ جب کبھی مطالعے کے دوران کسی اہم مسئلے یا نئی تحقیق پر نظر پڑے تو اس کا خلاصہ یا کم از کم حوالہ اس بیاض میں متعلقہ باب کے تحت درج کر لیا جائے۔ اس طرح نادر یادداشتوں اور حوالوں کا ایک گراں قدر ذخیرہ جمع ہو جاتا ہے اور ضرورت کے وقت اس میں بہت سی کام کی باتیں یا مفید حوالے مل جاتے ہیں۔(۲)

یہاں آدابِ فتویٰ اللہ تعالیٰ کی مدد اور توفیق سے مکمل ہوئے۔ افتاء کی تمرین کرنے والوں کو چونکہ سب سے زیادہ واسطہ شامیہ سے پڑتا ہے اس لیے آخر میں فقہ وفتویٰ کی اس شہرہ آفاق کتاب کا تعارف تحریر کیا جاتا ہے۔

۱- تفسیر طبری: ۳ / ۲۴۰

۲- البلاغ، مفتی اعظم نمبر: ۱/ ۳۷۰

فیض الغفار

تعارف

رد المحتار

فقہ حنفی کی شہرۂ آفاق کتاب "شامیہ" کا مکمل تعارف،
سو سے زائد کتب فقہ اور اعلام فقہاء کا تذکرہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف

ردّ المحتار على الدرّ المختار شرح تنوير الأبصار

اس کتاب میں ایک متن ہے، ایک شرح، ایک حاشیہ اور آخر میں تکملہ۔

متن:

متن کا پورا نام "تنوير الأبصار وجامع البحار" ہے، جو شیخ الاسلام محمد بن عبداللہ التمر تاشی الحنفی الغزی (٩٣٩-١٠٠٤ھ) کی تصنیف لطیف ہے۔ اسے اختصاراً "التنوير" بھی کہہ دیتے ہیں، اس صورت میں الف لام مضاف الیہ سے عوض ہوتا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے: "قال في التنوير".

شرح:

یہ متن شہرۂ آفاق تصنیفات میں شمار ہوتا ہے، اس کی چار مشہور شروحات لکھی گئی ہیں:

١- ایک شرح خود مصنف نے لکھی ہے، اس کا نام "منح الغفار" ہے۔ الدر المختار میں جہاں کہیں "وأقره المصنف في المنح" یا "كذا حرره المصنف" آتا ہے، اس سے مصنف علیہ الرحمۃ کی اسی شرح کا حوالہ مقصود ہوتا ہے۔ اس شرح پر شیخ الاسلام علامہ خیر الدین الرملی رحمۃ اللہ علیہ نے حاشیہ لکھا ہے، اس حاشیہ کا حوالہ اکثر شامیہ میں آتا ہے، مثلاً: ''باب المیاہ'' میں ہے:

"وقال الرملي في حاشية المنح: "ومن راجع كتب المذهب، وجد أكثرها على عدم الجواز [أي عدم جواز التطهير بما يقطر من الفواكه أو الكرم بنفسه] فيكون المعول عليه". (1)

١- ١٨١/١ كراتشي

۲- دوسری شرح ملا حسین بن اسکندر رومی نے لکھی ہے۔

۳- ایک شرح ابن عبد الرزاق عبد الرحمٰن بن ابراہیم دمشقی رحمۃ اللہ علیہ (۱۰۷۵ھ ۱۱۳۸ھ) نے لکھی ہے، جو دمشق کے مدرسہ ناصریہ کے مدرس تھے۔ اس کا نام "مفاتیح الأسرار" ہے۔ یہ مخطوطہ ہے طبع نہیں ہوئی۔

٤- سب سے مشہور، متداول اور مقبول عام شرح مفتی شام علامہ علاء الدین محمد بن علی الحصنی الأثری، المعروف "الحصکفی" (پیدائش ۱۰۲۵ھ وفات ۱۰ شوال ۱۰۸۸ھ) کی تحریر کردہ ہے، جس کا نام "الدر المختار" ہے۔ (الدر: الجوهر، وهو اسم جنس يصدق على القليل والكثير، والمختار الذي يؤثر على غيره. ١هـ ط)

انہوں نے پہلے ایک طویل شرح لکھنی شروع کی، جس کا نام "خزائن الأسرار وبدائع الأفكار" رکھا، پھر طوالت کے خوف سے اس کا اختصار "الدر المختار" کے نام سے کیا۔ یہ ترکیب توصیفی ہے، اس کو "در المختار" پڑھنا غلط ہے، یا تو موصوف صفت دونوں کو معرف باللام پڑھا جائے، "الدر المختار" یا دونوں کو منکّر یعنی "در مختار"، اس صورت میں یہ فارسی ترکیب کی رُو سے صحیح ہوگا۔

اس شرح کا حوالہ اس کے اصل نام "الدر المختار" کے علاوہ کئی ناموں سے دیا جاتا ہے، مثلاً:

۱- اسے شرح التنویر بھی کہتے ہیں: فيقال: "قال في شرح التنوير أو قال شارح التنوير......"

۲- شارح کا لقب "علاء الدین" تھا، اس لئے ان کی کتاب کا حوالہ دیتے وقت "قال العلاء" بھی کہا جاتا ہے، اس صورت میں الف لام مضاف الیہ کا عوض ہوتا ہے۔

۳- شارح جس قریہ میں رہتے تھے، اس کا نام "علاء" تھا، اس کی طرف نسبت کر کے

"قال العلائی"...... بھی کہتے ہیں۔

یہ شرح متن کی تشریح کے ساتھ مسائل فقہیہ کے ضبط وتصحیح میں بے نظیر ہے، جب سے تصنیف ہوئی کتب فقہ میں ممتاز ترین درجہ حاصل کرگئی ہے، محشی علام خطبہ میں فرماتے ہیں:

"أما بعد: فيقول أحوج المفتقرين إلى رحمة أرحم الراحمين، محمد أمين، الشهير بابن عابدين: إن "كتاب الدر المختار، شرح تنوير الأبصار"قد طار في الأقطار، وسار في الأمصار، وفاق في الاشتهار على الشمس في رابعة النهار، حتى أكب الناس عليه، وصار مفزعهم إليه، وهو الحريّ بأن يطلب، ويكون إليه المذهب؛ فإنه الطراز المذهّب في المذهب، فلقد حوى من الفروع المنقحة، والمسائل المصححة ما لم يحوه غيره من كبار الأسفار، ولم تنسج على منواله يد الأفكار". [1]

شرح اور حاشیہ میں فرق یہ ہے کہ جب متن کی عبارت پوری نقل کی جائے، درمیان میں اس کی تشریح ہوتی جائے تو یہ شرح ہے، اور اگر متن کی عبارت پوری نقل نہ ہو، بلکہ بقدر ضرورت "قوله" کے ساتھ کچھ الفاظ لکھ کر اس کی توضیح کی جائے، تو یہ حاشیہ ہے۔ یہ اصل اصطلاح ہوئی۔ کبھی مجازاً ایک لفظ کا اطلاق دوسرے پر بھی کردیا جاتا ہے۔

حواشی:

اس شرح کے کئی حاشیے لکھے گئے ہیں، ان کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے، کیونکہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ ان کا حوالہ دیگر رمزی حروف کے ساتھ ان کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

١ - پہلا حاشیہ الشيخ المحقق، العلامة النحرير ابراهيم حلبی کا ہے۔ علامہ شامی ایک واسطے سے ان کے شاگرد ہیں، ان کی تحقیقات کا حوالہ حرف (ح) سے دیتے ہیں۔ اس حاشیے میں شرح پر جو اشکالات کئے گئے ہیں، علامہ شامی رحمہ اللہ نے کتابی

---

١ - خطبۂ ردالمحتار:٣

صورت میں ان سب کا جواب لکھا ہے، اس کا نام "رفع الأنظار عما أورده الحلبی علی الدر المختار" ہے۔

٢- دوسرا حاشیہ "حاشیة الطحطاوی" کے نام سے مشہور اور مطبوعہ صورت میں دستیاب ہے۔ یہ علامہ سید احمد الطحطاوی الحنفی کا تحریر کردہ ہے، علامہ شامی اس سے بھی بکثرت استفادہ کرتے ہیں، اور اس کی طرف "ط" سے اشارہ کرتے ہیں۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے حاشیہ کی تحریر کے وقت ان دونوں حواشی سے خصوصیت کے ساتھ مراجعت واستفادہ کیا ہے اور یہ حضرات چونکہ ان کے مشائخ میں سے تھے، لہٰذا ان کے ساتھ نہایت متأدبانہ رویہ اختیار کیا ہے، فرماتے ہیں:

"ثم أردت جمع تلك الفوائد، وبسط سمط ها تيك الموائد، من متفرقات الحواشی والرقاع؛ خوفا عليها من الضياع، ضاما إلى ذلك ما حرره العلامة الحلبی، والعلامة الطحطاوی، وغيرهما من محشی هذا الكتاب، وربما عزوت ما فيهما إلى كتاب آخر؛ لزيادة الثقة بتعدد النقل لا للإغراب، وإذا وقع فی كلامهما ما خلافه الصواب أو الأحسن الأهم، أقرر الكلام على ماينا سب المقام، وأشير إلى ذلك بقولی: "فافهم" ولاأصرّح بالاعتراض عليهما؛ تأدباً معهما".[1]

٣- تیسرا حاشیہ العلامہ الشیخ مصطفیٰ رحمتی الانصاری کا ہے۔ یہ بھی ایک واسطے سے علامہ شامی کے استاذ ہیں، شامیہ میں ان کے لئے "رحمتی" کا رمز اختیار کیا گیا ہے۔

٤- چوتھا حاشیہ العلامہ عبد الرحمٰن بن ابراہیم بن احمد الحنفی الدمشقی المعروف بابن عبد الرزاق کا ہے، اور محفوظ ہے۔ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ صاحب درمختار کے حالات بیان کرتے ہوئے اس حاشیے کو شرح کے نام سے یاد کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وهو رحمه الله تعالى. كما فی شرح ابن عبد الرزاق على هذا الشرح:

١- خطبۂ ردالمحتار: ٤

محمد بن علی بن محمد بن علی بن عبد الرحمن بن محمد بن جمال الدین بن الحسن بن زین العابدین الحصنی الأثری، المعروف بالحصکفی، صاحب التصانیف فی الفقه وغیره"[1].

انہی محشی نے فقہ حنفی کے مشہور متن "ملتقی الأبحر" کی "کتاب الفرائض" کو منظوم صورت میں ڈھالا تھا اور اس کا نام "قلائد المنظوم" رکھا۔ علامہ شامی نے اس کی شرح لکھی ہے بنام "الرحیق المختوم"، یہ شرح مجموعۂ رسائل ابن عابدین میں شامل ہے۔ اس حاشیہ کے لئے شامیہ میں "ابن عبد الرزاق" کا رمز اختیار کیا گیا ہے۔

۵- سب سے مقبول، مستند اور جامع حاشیہ، خاتمۃ المحققین، السید الشریف، الجامع بین الحسب والنسب، العلامہ محمد بن امین بن عمر المعروف بابن عابدین الشامی کا ہے۔ (پیدائش ۱۱۹۸ھ، وفات ۱۲۵۲ھ) عابدین ان کے ابِ سادس، السید الشریف محمد صلاح الدین کا لقب ہے، اس نسبت سے ابن عابدین سے مشہور ہیں۔ یہ نجیب الطرفین سادات میں سے ہیں، ستائیسویں پشت میں ان کا نسب امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ سے اور تینتیسویں پشت میں فخر موجودات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جاملتا ہے۔

اس حاشیہ کا اصل نام "رد المحتار" ہے بالحاء المهملة. یہ ترکیب اضافی ہے، رد کا معنی ہے لوٹانا محتار کے معنی حیران وسرگردان، یعنی جو شخص "الدر المختار" کے سمجھنے اور مسائل کے حل میں حیران وپریشان ہے (اور علم آتا ہی اس شخص کو ہے جس کا علمی ذوق ایسا ہو کہ جب تک مسئلہ حل نہ ہو وہ حیران وپریشان رہے) یہ کتاب اس کی حیرت کو دور کر کے اسے مطمئن کر دے گی۔ محشی علام اس کی وجہ تسمیہ ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فدونك حواشی هی الفریدة فی بابها، الفائقة علی أترابها، المسفرة عن نقابها، لطلابها وخطابها. قد أرشدت من احتار من الطلاب، فی فهم معانی هذا

۱- ردالمحتار: ۱/۱۵

الكتاب؛ فلهذا سميتها "رد المحتار على الدر المختار"[1].

اس کا دوسرا نام "حاشية ابن عابدين" ہے۔ ممالک عربیہ میں اسی نام سے مشہور ہے۔ تیسرا نام "شاميّة" (بالياء المشدده) یا "شامی" ہے۔ مصنف چونکہ شام کے رہنے والے تھے، اس لئے ان کے علاقے کی نسبت سے یہ نام ہے، جیسے: "صحيح البخاری" کو "بخاری" کہتے ہیں۔

محشی محقق رحمۃ اللہ علیہ کو الدر المختار سے حد درجہ شغف اور اس کے مصنف سے انتہائی انسیت تھی، حتیٰ کہ انہوں نے اپنے بیٹے کا نام شارح کے نام پر "علاء الدين" رکھا اور ان کی ولادت کی تاریخ اپنے پاس موجود "الدر المختار" کے نسخے کی پشت پر لکھی اور اپنی وفات سے بیس روز قبل اپنی قبر کیلئے شارح کی قبر کے برابر جگہ منتخب کی جو آج بھی دمشق کے مقبرہ میں "الباب الصغير" کے پاس موجود ہے، اور اس میں دفن کیے جانے کی وصیت کی۔ نیز شارح کی دیگر دو کتابوں پر بھی حاشیہ لکھا، ایک "ملتقى الأبحر" کی شرح "الدر المنتقى فی شرح الملتقى" پر اور ایک اصول فقہ کی مشہور کتاب "المنار" کی شرح "إفاضة الأنوار" پر۔ اس کے انہوں نے دو حاشیے لکھے: ایک کبریٰ اور دوسرا صغریٰ، ان میں سے ایک کا نام "نسمات الأسحار على إفاضة الأنوار" ہے۔ نیز شارح کی مدح میں ایک قصیدہ بھی لکھا ہے، جیسا کہ محشی کے فرزند اپنے والد ماجد کے تذکرے میں فرماتے ہیں:

"وكان قبل موته بعشرين يوماً قد اتخذ لنفسه القبر الذی دفن فيه، وكان دفن فيه بوصية منه؛ لمجاورته لقبر العلامتين الشيخ العلائی شارح التنوير، والشيخ صالح الجنينی، إمام الحديث ومدرّسه، تحت قبة النسر، وهذا مما يدل على حبه للشارح العلائی لاسيما وقد حشى له شرحيه على "الدر" و"الملتقى"، وشرحه على "المنار"، وسمّانی باسمه، وأرخ ولادتی على ظهر كتابه "الدر المختار" فی ليلة الثلثاء لثلثة مضين من شهر ربيع الثانی سنة ١٢٤٤هـ رحمه اللّٰه تعالى العزيز الغفار،

۱- خطبۂ ردالمحتار: ۱/ ٤

وقد مدحه بقصيدة، وهى قوله:

علاء الدين يا مفتى الأنام ☆☆ جزاك اللّٰه خيرا على الدوام
لقد أبرزت للفتيا كتاباً ☆☆ مبينا للحلال والحرام
لقد أعطيت فضلا لا يضاهى ☆☆ وعلماً وافراً كالصب طام
فكنت به فريد العصر حتما ☆☆ كمثل البدر فى وفق التمام
وكان بك الزمان خصيب عيش ☆☆ رطيباً ذا حبور وابتسام
وفاق بدرّك المختار عقد ☆☆ لفقه أبى حنيفة ذوانتظام
بألفاظ ترين الصعب سهلا ☆☆ ومطروحا على طرف الثمام
إذا ما قلت قولاً قيل فيه ☆☆ على قول إذا قالت حذام
صغير الحجم حاوى الجل مما ☆☆ تنقح فى رُبى الكتب العظام
فكل الصيد فى جوف الفرا إن ☆☆ تقل ذا، لست تخشى من ملام
حوى اسما قد أتى طبق المسمى ☆☆ وما تأتى كذا كل الأسامى[1]

محشی علام علیہ الرحمۃ والرضوان نے یہ حاشیہ "کتاب الاجارہ" سے لکھنا شروع کیا پھر آخر تک پورا کرنے کے بعد "کتاب الطھارۃ" سے شروع کرکے کتاب الاجارہ تک مکمل کیا، اس صنعت کی وجہ بیان کرتے ہوئے ایک مؤرخ لکھتے ہیں:

"أما الحاشية التى أجل ما ترك فهى عمدة المذهب الحنفى، وبابه الحصين، ضمنها خلاصة فكره، وعصارة تحقيقه؛ ذلك أنه رأى "الدر المختار" ومافيه من الاختصار الذى أغلق كثيرا من مسائله، ورأى أنه لابد من شرح يوضح مراميه، ويبين معانيه، ولكنه رأى كثيرا من المؤلفين، أصحاب الكتب الكبار، كفتح القدير وغيره محررا إلى باب الإجارة، ثم غالباً ما يموت المؤلف، أو أستاذ الدرس، فيبقى الكتب

۱۔ تکملۂ ردالمحتار: ۳

ناقصاً؛ لذا بدأ ابن عابدين بتحرير كتابه من "باب الإجارة" قائلاً:

"إن لم يساعد الأجل يكون كتابي هذا إتماماً لنواقص غيره، وإن ساعد الأجل أعود لإكمالها".

وفعلاً بدأ بتصنيف حاشيته هذه تحت اشراف شيخه الشيخ سعيد الحلبي، بعد أن قرأ "الدر" معه وعلق عليه، ثم قرأ "الدر" عليه مرة ثانية بحاشية إبراهيم الحلبي، وكان خلال ذلك يعرضها على شيخه بين الحين والآخر، فيعجب بها مصرحا بذلك وهو يقول:

"أما آن لهذه الصبرة أن تنتهي؟" وبدأ أولا من "باب الإجارة" إلى آخرها، كما سبق ثم عاد إلى البداية، وأتم ذلك إلى "باب الإجارة" أيضاً حتى تم الكتاب كاملاً، ثم شرع بالتبييض كما بدأ، ولم يسمح له الأجل تبييض الجميع حتى قض الله تعالى ولده علاء الدين، فأكمل تبييض ما بدأ به والده عن خطه، وألحقت بمجلدين سماها: "قرة عيون الأخيار بتكملة ردالمحتار". وقد ذكر ترجمة والده في بداية التكملة وذكر اصطلاحاته. فارجع إليها".[1]

فضیلت:

یہ کتاب بہت بابرکت اور مقبول عند اللہ وعند الناس ہے۔ جس طرح اس کتاب کا متن پچھلی تمام کتب فقہ میں امتیازی مقام رکھتا ہے اور جس طرح اس متن کی تمام شروح میں سے "الدر المختار" ممتاز ترین شرح ہے، اسی طرح یہ حاشیہ اس کتاب کے تمام حواشی میں بہترین اور جامع ہے۔ شارح نے شرح کی ابتداء اولاً روضۂ نبویہ (علی صاحبها ألف ألف سلام وتحية) کے سامنے کی، پھر حطیم ومقام کے درمیان، نیز مصنف وشارح رحمہما اللہ دونوں خواب

١۔ دیکھیے: شامیہ پر استاذ محمد بکر اسماعیل کا مقدمہ۔

میں بشارت نبویہ سے سرفراز ہوئے ہیں، جیسا کہ شارح فرماتے ہیں:

"وأتممت نعمتك علينا حيث يسرت ابتداء تبييض هذا الشرح المختصر تجاه وجه منبع الشريعة والدرر، وضجعيه الجليلين أبي بكر وعمر، بعد الإذن منه صلى الله عليه وسلم.

وفي رد المحتار: "قوله بعد الإذن: متعلق بقوله يسرت أو إبتداء، وكأن الإذن للشارح حصل منه صلى الله عليه وسلم صريحاً برؤية منام أو إلهام، وببركته صلى الله عليه وسلم فاق هذا الشرح على غيره كما فاق متنه، حيث رأى المصنف النبي صلى الله عليه وسلم، فقام له مستقبلاً واعتنقه عجلا، و ألقمه عليه الصلوة والسلام لسانه الشريف، كما حكاه في المنح، فكل من المتن والشرح من آثار بركته صلى الله عليه وسلم، فلاغر وأن شاع ذكرهما وفاق، وعم نفعهما في الآفاق". [1]

خود محشی علام علیہ رحمۃ رب الانام صرف بلند پایہ محقق ومصنف ہی نہیں، عظیم المرتبہ روحانی شخصیت بھی تھے۔ انہوں نے روحانی تربیت اور اسباق تصوف کی تکمیل اپنے مربی واستاذ، شیخ الوقت السید محمد شاکر السالمی، المعمر ی، الشہیر بابن مقدم سعد کے پاس کی۔ یہ بلاد شام میں سلسلہ قادریہ کے شیخ وقت تھے۔ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے جملہ علوم وفنون کی تعلیم انہی سے پائی تھی۔ ان کی مدح میں علامہ شامی نے مقامات حریری کی طرح مقامات لکھے ہیں۔ علامہ شامی نے اپنا تمام وقت ذکر وعبادت، درس وتدریس، افتاء وتصنیف کیلئے وقف کر رکھا تھا۔ اپنا کاروبار بھی خود نہیں کرتے تھے، ایک شریک کو سونپ رکھا تھا۔ عادت تھی کہ رمضان کی ہر رات ایک قرآن کریم ختم کرتے تھے۔ عام دنوں میں اکثر ساری ساری رات گریہ وزاری اور تلاوت میں گزر جاتی تھی۔ تصوف سے ان کو خاص شغف تھا، ان کے تصوف سے متعلق دو رسالے ہیں: ایک کا نام

۱۔ خطبۂ رد المحتار: ۱۲

ہے:"إجابة الغوث، ببيان حال النقباء والنجباء والأبدال والأوتاد والغوث"۔ یہ رسالہ ایک سوال کے جواب میں لکھا تھا، جس میں قطب، غوث اور ابدال وغیرہم کے بارے میں استفسار کیا گیا تھا۔ اس میں اس سوال کے جواب کے علاوہ تصوف سے متعلق مزید تفصیلات بھی ذکر ہیں۔

دوسرا رسالہ "سلّ الحسام الهندی لنصرة مولانا خالد النقشبندی" ہے۔

اس کے لکھنے کا سبب یہ ہوا کہ شام کے ایک ممتاز عالم ضیاء الدین خالد نقشبندی ہندوستان آئے اور مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ (۱۱۵۶ھ - ۱۲۴۰ھ) کے پاس اسباقِ تصوف کی تکمیل کی اور خلعت خلافت سے سرفراز ہو کر واپس گئے[1]۔ وہاں ان کو کچھ معاندین کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، انہوں نے ان پر مختلف اعتراضات اٹھائے، ان کے جواب میں علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ رسالہ لکھا۔ اس میں صوفیاء کے نزدیک مروج امور کے استناد اور ان کے حال وقال پر مفصل کلام کیا ہے۔ یہ دنوں رسائل مجموعہ رسائل ابن عابدین جزوِ دوم میں موجود ہیں۔

ان کی سعادت ونجابت اور منجانب اللہ توفیق قبولیت اور ان روحانی مراتب کا اندازہ جو ان کو حاصل تھے، ان دو واقعات سے لگایا جا سکتا ہے جو ان کے صاحبزادے نے "تكملة رد المحتار" کے مقدمے میں اپنے والد کے حالات میں لکھے ہیں:

۱- وكان سيدی رحمه اللّٰه تعالیٰ ذهب مرة مع شيخه السيد محمد شاكر المذكور لزيارة بعض علماء الهند وصلحائها الشيخ محمد عبد النبی، لما ورد دمشق، فلما دخلا عليه جلس شيخ سيدی، وبقی سيدی واقفاً فی العتبة بين يدی شيخه حاملا نعله بيده، كما هو عادته مع شيخه، فقال الشيخ محمد عبد النبی لشيخ سيدی: "مر هذ الغلام السيد فليجلس، فإنی لا أجلس حتی يجلس؛

۱- دیکھیے: تاریخ دعوت وعزیمت: ۳۶۸/۴

فإنه ستقبل يده، وينتفع بفضله فى سائر البلاد، وعليه نور آل بيت النبوة". فقال له الشيخ محمد شاكر: اجلس يا ولدى!

وكذلك وقع له مع شيخه المذكور إشارة نظير هذه من الإمام الصوفى الشهير، والولى الكبير، الشيخ طاهر الكردى قدس سره، ومن ذاك الوقت زاد اعتناء الشيخ به، والتفاته إليه بالتعليم.[1]

۲- وكان له عم من أهل الصلاح، ومظنة الولاية، ومن أهل الكشف، اسمه الشيخ صالح، اسم على مسمى، حتى أنه بشرأمه به قبل ولادته، وهو الذى سماه "محمد أمين" حين كان فى بطن أمه، ويضعه فى حال صغره فى حجره، ويقول له: أعطيتك عطية الأسياد فى رأسك.[2]

ان کے زہد وتقویٰ، اخلاص وللّٰہیت، خدمت اساتذہ وشیوخ کی بنا پر اس کتاب کو ایسا قبول عام اور شہرت دوام حاصل ہوئی جس کی نظیر نہیں ملتی۔ الاستاذ محمد بکر اسماعیل نے شامیہ پر اپنے مقدمے میں مندرجہ ذیل واقعہ نقل کیا ہے، جس سے اس کتاب کی مقبولیت ومحبوبیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''علماء کے دلوں میں اس کتاب کی قدر ومنزلت اس واقعہ سے معلوم ہوتی ہے جو بعض متأخرین کو خلافت عثمانیہ کے دار الخلافہ میں پیش آیا:

"الدر المختار" کی "بحث الاشربہ" میں یہ لکھا ہے کہ تمبا کو نوشی حرام ہے کیونکہ حاکم نے اس سے منع کیا ہے۔ (اس حاکم سے مراد عثمانی خلیفہ سلطان مراد رابع ہے) اور حکم حاکم واجب الاتباع ہے۔

ابن عابدین نے اس پر رد کیا ہے کہ حلال وحرام کرنا حاکم کا کام نہیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے حالانکہ ہمارے فقہاء نے کہا ہے کہ اگر کوئی شخص موجودہ حاکم کو عادل کہہ دے تو اس نے کفر کیا،

۱- تکملہ: ص ۱۱

۲- تکملہ: ص ۲

کیونکہ اس نے اس کے ظلم کو عدل مان لیا، اس کی تحقیق ابن عابدین نے بھر پور طریقے سے "بحث الاشربة" میں کی ہے۔

اس پر عثمانی سلطنت کے دارالخلافہ استنبول میں وزارۃ المعارف کے ایک بڑے افسر نے "ردالمحتار" کے متعلق رپورٹ پیش کی کہ اس کتاب میں ایک خطرناک اور ہنگامہ خیز بات ہے یعنی مذکورہ بالا مسئلہ، فوراً حکم جاری ہوا کہ اس کتاب کو تمام کتب خانوں سے ضبط کرلیا جائے۔ چنانچہ علی الاعلان لوگوں کے سامنے اس پر عملدرآمد ہوا، تو علمی حلقوں میں سخت ناگواری پھیل گئی۔ یہ واقعہ ۱۳۲۰ھ کے گردو پیش میں پیش آیا، چنانچہ علامہ معمر ابوالمحاسن یوسف الکوشی، رئیس العلماء کھڑے ہوئے، اور اپنے ہمراہ بزرگ محدث شیخ محمد فرہاد الریزدی رحمہما اللہ کو لیا، اور دونوں اس وقت کے دارالخلافہ کے بڑے علماء میں سے تھے۔ یہ حضرات براہ راست قصر سلطانی میں گئے، جب وہ سلطان کے دربار میں پہنچے تو اس سے کہا:

"ہمارا آپ سے جو تعلق دین کی بنیاد پر ہے، یقیناً آپ پر مخفی نہ ہوگا، ہم اس تعلق کی بنا پر آئے ہیں کہ جناب تک یہ بات پہنچائیں کہ کتاب "رد المحتار" جس سے کسی بھی عالم کا گھر خالی نہیں ہوسکتا، اس کو جس بری طرح سے ضبط کیا گیا اس نے مخلص لوگوں کے دلوں کو خون کے آنسو رلایا ہے۔ جو مسئلہ اس کی طرف منسوب کیا گیا ہے، وہ تقریباً ہر فقہی کتاب میں موجود ہے۔ ہم نے اپنے فرض منصبی کے تحت یہ بات آپ تک پہنچادی ہے"۔

اس طرح کی بات اس زمانے میں بہت بڑی جرأت سمجھی جاتی تھی لیکن ان دونوں پاکباز علماء کی کوشش کامیابی کے تاج سے سج گئی، اور شاہی فرمان جاری ہوا کہ ان کتابوں کو ان کے مالکان کے حوالے کیا جائے نیز یہ کہ اس بڑے افسر کو بھی برطرف کردیا جائے جس نے یہ رپورٹ مشرق بعید کے بلاد سے بھیجی تھی تاکہ اس کو وہاں کسی قصبے میں طویل ملازمت مل سکے۔

اسی طرح باعمل علماء کی عادت تھی کہ وہ اللہ کی شریعت کے لئے غیرتمند تھے، بس طاقت اور توفیق تقویٰ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔"

اہمیت:

افتاء کے کام میں سب سے زیادہ اہمیت ”رد المحتار“ کی ہے، اس کی کئی وجوہات ہیں:

١- پہلی وجہ یہ ہے کہ مصنف رحمۃ اللہ علیہ دوسرے مصنفین سے متأخر ہیں، انہوں نے پچھلے تمام فقہاء کی کتب کو سامنے رکھ کر یہ کتاب تصنیف کی ہے لہٰذا اس کتاب میں فقہاء امت کی بارہ صدیوں کی محنت اور تحقیقات کا نچوڑ آ گیا ہے۔

٢- دوسری وجہ اس کتاب کا مستند ہونا ہے۔ مصنف نے کوئی بات نقل کرتے وقت صرف نقل پر اعتماد نہیں کیا، بلکہ التزام کے ساتھ اہتمام کیا کہ اس بات کی تحقیق کی جائے کہ قائل اول کون تھے اور ان کی اپنی اصل عبارت کیا ہے؟ کیونکہ کبھی ناقل اول سے غلطی ہوجاتی ہے، بعد والے حضرات کو اس کا علم نہیں ہو پاتا، وہ ناقل اول پر اعتماد کر کے نقل کرتے چلے جاتے ہیں۔

مصنف رحمہ اللہ تعالیٰ نے ”شرح عقود رسم المفتی“ میں اس کی کئی مثالیں دی ہیں، فرماتے ہیں:

”وقد يتفق نقل قول فى نحو عشرين كتابا من كتب المتأخرين ويكون القول خطأً، أخطأ به أول واضع له، فيأتى من بعده، وينقل عنه، وهكذا ينقل بعضهم عن بعض، كما وقع ذلك فى بعض مسائل...... ومن ذلك مسئلة الاستئجار على تلاوة القرآن المجردة...... ومسئلة عدم قبول توبة السابّ للجناب الرفيع صلى الله عليه وسلم ولهذا الذى ذكرنا نظائره كثيرة، اتفق فيها صاحب "البحر" و "النهر" و "المنح" و "الدر المختار" وغيرهم، وهو سهو منشأها الخطاء فى النقل، أو سبق النظر، نبهت عليها فى حاشيتى رد المحتار، لالتزامى فيها مراجع الكتب المتقدمة التى يعزون المسئلة اليها، فأذكر أصل العبارة التى وقع السهو فى النقل عنها، وأضم

اليهـا نـصـوص الـكتـب الموافقة لها؛ فلهذا كانت الحاشية عديمة النظير فى بابها، لايستغنى أحد عن تطلابها، أسئله سبحانه أن يعيننى على إتمامها.

فإذا نظر قليل الاطلاع ورأى المسئلة مسطورة فى كتاب أو أكثر، يظن أن هذا هـو الـمذهب ويفتى به ويقول: إن هذه الكتب للمتأخرين الذين اطلعوا على كتب من قبـلهم، وحرروا فيها ما عليه العمل، ولم يدر أن ذلك أغلبى، وأنه يقع منهم خلافه كما سـطرناه لك، وقد كنت مرّة أفيت بمسئلة فى الوقف موافقا لما هو المسطور فى عامة الـكتب، وقـد اشتبـه فيهـا الأمر على الشيخ علاء الدين الحصكفى عمدة المتأخرين، فـذكـرهـا فـى "الدر المختار" على خلاف الصواب،فوقع جوابى الـذى أفتيت به بيد جـمـاعة مـن مفتى البلاد، كتبوا فى ظهره بخلاف ما أفتيت به، موافقين لما وقع فى "الدرالمختار" وزاد بعض هولاء المفتين: "أن هذا الذى فى "العلائى" هو الذى عليه الـعـمل؛ لأنه عمدة المتأخرين وأنه ان كان عندكم خلافه لا نقبله منكم،" فانظر إلى هـذا الـجهـل الـعظيم، والتهور فى الأحكام الشرعية، والإقدام على الفتيا بدون علم وبـدون مـراجـعة، وليت هذا القائل راجع حاشية العلامة الشيخ إبراهيم الحلبى على "الـدر الـمختار" فإنها أقرب ما يكون إليه، فقد نبه فيها على أن ما وقع للعلائى خطأ فـى التـعبيـر. وقد رأيت فى فتاوى العلامة ابن حجر رحمه اللّٰه سئل عن شخص يقرأ ويـطـالـع الـكتب الفقهية بنفسه ولـم يكن له شيخ، و يفتى، ويعتمد على مطالعته فى الكتب، فهل يجوز له ذلك أم لا؟

فأجاب بقوله: لايجوز له الإفتاء بوجه من الوجوه، لأنه عامى جاهل لايدرى ما يقول، بل الذى يأخذ العلم عن المشايخ المعتبرين، لايجوز له أن يفتى من كتاب، ولامـن كتابين بل قال النووى رحمه اللّٰه: "ولا مـن عشرة؛ فإن العشرة والعشرين قد

یعتمدون کلهم علی مقالة ضعیفة فی المذهب؛ فلا یجوز تقلیدهم فیها ". بخلاف الماهر الذی أخذ العلم عن أهله، وصارت له فیه ملکة نفسانیة؛ فإنه یمیز الصحیح من غیره، ویعلم المسائل وما یتعلق بها علی الوجه المعتدّ به، فهذا هو الذی یفتی الناس ویصلح أن یکون واسطة بینهم وبین اللّٰه تعالیٰ، وأما غیره فیلزمه إذا تسور هذا المنصب الشریف، التعزیر البلیغ، والزجر الشدید الزاجر ذلك لأمثاله عن هذا الأمر القبیح الذی یؤدی إلی مفاسد لاتحصی. واللّٰه تعالی أعلم.[1]

۳- تیسری وجہ اس کتاب کا جامع ہونا ہے، مصنف محقق کی عادت ہے کہ سابقہ تمام اقوال ومباحث کو سامنے رکھ کر تطبیق یا ترجیح کی صورت بیان فرماتے ہیں۔ علماء متقدمین کی کتب رسوخ فی العلم میں بہت بڑھ کر ہیں، لیکن مفتی کیلئے "ردالمحتار" سے استغناء نہیں۔ دوسری کتب سے فتوی دینا چاہیں تو بہت سی کتب کا مطالعہ کرنا ضروری ہوگا، کیونکہ ترجیح میں اختلاف ہوتا ہے یا قول مطلقاً ذکر ہوتا ہے جب کہ وہ مقید ہوتا ہے اس لیے مفتی کیلئے کافی محنت کے بعد بھی ترجیح یا معرفت قیود میں غلطی کا احتمال رہتا ہے۔ "رد المحتار" دیکھنے والا اتنی محنت سے بھی بے نیاز ہوجاتا ہے اور غلطی کا امکان بھی کم ہوجاتا ہے، اسی وجہ سے یہ کتاب اپنے وقت تحریر سے آج تک مرجع اہل افتاء ہے۔ علامہ خود خطبہ کتاب میں فرماتے ہیں:

"وقد التزمت فیما یقع فی الشرح من المسائل والضوابط، مراجعة أصله المنقول عنه وغیره؛ خوفاً من إسقاط بعض القیود والشرائط، وزدت کثیرا من فروع مهمة، فوائدها جمة، ومن الوقائع والحوادث علی اختلاف البواعث، والأبحاث الرائقه، والنکت الفائقة، وحل العویصات، واستخراج الغویصات، وکشف المسائل المشکلة، وبیان الوقائع المعضلة، ودفع الإیرادات الواهیة من أرباب الحواشی، والانتصار لهذا الشارح المحقق بالحق ورفع

۱- ٤٦-٥٧

الغواشی، مع عزو کل فرع إلی أصله، و کل شئ إلی محله، حتی الحجج و الدلائل، و تعلیلات المسائل، و ما کان من مبتکرات فکری الفاتر، و مواقع نظری القاصر، أشیر الیه، و أنبه علیه، و بذلت الجهد فی بیان ما هو الأقوی، و ما علیه الفتوی، و بیان الراجح من المرجوح، مما أطلق فی الفتاوی أو الشروح، معتمدا فی ذلک علی ما حرره الأئمة الأعلام، من المتأخّرین العظام، کالإمام ابن الهمام، و تلمیذیه العلامة قاسم و ابن أمیر الحاج، و المصنف، و الرملی، و ابن نجیم، و ابن الشلبی، و الشیخ إسماعیل الحائك و الحانوتی السراج، و غیرهم ممن لازم علم الفتوی، من أهل التقویٰ"۔[1]

٤- چوتھی وجہ ہے کہ محشی رحمہ اللہ انتہائی محتاط تھے، ان سے افراط وتفریط نہیں دیکھا گیا، مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں:

"علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ انتہائی وسیع المطالعہ ہونے کے باوجود اس قدر تقویٰ شعار اور محتاط بزرگ ہیں کہ عام طور سے اپنی ذمہ داری پر کوئی مسئلہ بیان نہیں کرتے، بلکہ جہاں تک ممکن ہوتا ہے اپنے سے پہلے کی کتابوں میں سے کسی نہ کسی کے حوالے سے بیان فرماتے ہیں۔ اگر ان اقوال میں بظاہر تعارض ہو تو ان کو رفع کرنے کیلئے بھی حتیٰ الامکان کسی دوسرے فقیہ کے قول کا سہارا لیتے ہیں اور جب تک بالکل مجبوری نہ ہو جائے خود اپنی رائے ظاہر نہیں فرماتے۔ اور جہاں ظاہر فرماتے ہیں وہاں بالعموم آخر میں "تأمل یا تدبر" کہہ کر خود بری ہو جاتے ہیں، اور ذمہ داری پڑھنے والے پر ڈال دیتے ہیں۔ یہی وجہ کہ بسا اوقات الجھے ہوئے مسائل میں ہم جیسے لوگوں کو ان کی کتاب سے مکمل شفاء نہیں ہوتی۔

لیکن یہ طریقہ "رد المحتار" میں رہا ہے، مگر چونکہ علامہ شامی رحمہ اللہ نے "البحر الرائق" کا حاشیہ "منحة الخالق" اور "تنقیح الحامدیة" بعد میں لکھا ہے، اس لئے ان کتابوں میں مسائل زیادہ

۱- خطبۂ رد المحتار: ٤

منقح انداز میں آئے ہیں جنہیں پڑھ کر فیصلہ کن بات معلوم ہو جاتی ہے۔"[۱]

کتاب سے استفادہ کا طریقہ:

اس کتاب سے مسئلہ تلاش کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے مسئلہ کے مظان متوقعہ متعین کریں، یعنی یہ مسئلہ کس کتاب یا باب سے تعلق رکھتا ہے؟ صلوۃ سے یا زکوۃ سے، بیوع سے یا حظر واباحت سے۔اس کے بعد پہلے فہرست میں دیکھیں، شامیہ کی فہرست میں اکثر اہم مسائل پر مطالب کے نام سے عنوانات قائم کئے ہوئے ہیں، کسی مطلب کے تحت بعینہ مسئلہ مل جائے تو فبھا، ورنہ مطلوبہ مسئلے سے قریب ترین مطلب کے تحت دیکھیں، اگر ایسا مطلب بھی نہ ملے تو متعلقہ باب یا فصل کا متن دیکھنا شروع کریں۔اگر صراحۃً متن میں نہیں ملا تو متن کے کسی مسئلے سے اس کی مناسبت ہو تو وہاں شرح دیکھیں، پھر حاشیہ بھی دیکھیں، اگر نہ ملے تو باب کے آخر میں "فروع" کے عنوان سے متفرق اہم مسائل ہوتے ہیں۔ان کے بعد اشعار ہوتے ہیں، یہ بھی اہم مسائل پر مشتمل ہوتے ہیں، ان فروع اور اشعار کی حیثیت ہر باب کے "مسائل شتی" کی ہے، جو مسئلہ اثناء باب میں نہ ہو وہ ان میں ذکر کیا جاتا ہے، لہذا ان کو بھی دیکھیں۔ ان میں بھی نہ ملے تو کتاب کے آخر میں جلد خامس میں "کتاب الفرائض" سے پہلے "مسائل شتی" کے عنوان سے ہر باب کے رہ جانے والے مسائل ذکر کئے گئے ہیں، ان میں تلاش کریں۔مسئلہ کی تلاش میں کامیابی کی کلید یہ ہے کہ جہد مسلسل جاری رکھی جائے، تھکن اور گھبراہٹ کو قریب نہ پھٹکنے دیا جائے۔جس کو اس مشقت کے تحمل اور ورق گردانی کی عادت پڑ گئی، درحقیقت اسے "مفتاح النجاح" ہاتھ لگ گئی۔

پھر جب مسئلہ مل جائے تو اس کی تخریج کا طریقہ یہ ہے کہ اسے پورے سیاق وسباق کے ساتھ اولاً متن وشرح میں دیکھا جائے، پھر حاشیے میں اس کے متعلق جتنی بحث ہو، مکمل دیکھی

۱- البلاغ، مفتی اعظم نمبر: ۱۳۹۹ھ

جائے۔ جہاں آپ سمجھیں کے بحث ختم ہو رہی ہے اس سے بھی تھوڑا آگے دیکھیں کیونکہ بعض مرتبہ ایک مسئلہ کی کچھ شروط وقیود تھوڑا آگے جا کر ذکر ہوتی ہیں یا اس پر مزید بحث وتحقیق ہوتی ہے۔ بعض اوقات اس کا طرز یہ ہوتا ہے کہ اولا ایک قول کا دلائل کے ساتھ اثبات کیا جاتا ہے۔ پھر اس کا رد کیا جاتا ہے، پھر رد کا رد کر کے اول کا اثبات ہوتا ہے، یہ محققین کی عادت ہوتی ہے، وہ مقصود کے اثبات میں حائل ان تمام شبہات کا حل کرتے ہیں جن کے وارد ہونے کا امکان ہوتا ہے، اور قول مرجوح کے حق میں جتنے دلائل ہوتے ہیں۔ ان سب پر کلام کرتے ہیں تا کہ مسئلہ کے تمام پہلو واضح ہو کر بے غبار ہو جائیں نیز یہ غرض بھی ہوتی ہے کہ طالب بھی تحقیق کا طریقہ سیکھے، لہٰذا مکمل بحث کو آگے تک دیکھنا چاہیے، آخر تک پہنچے بغیر نتیجہ بحث سے آگاہی حاصل نہیں ہوتی، کبھی شارح ماتن کی تحقیق سے متفق نہیں ہوتے، اور کبھی شارح کی تحقیق محشی کے نزدیک قابل اطمینان نہیں ہوتی، لہذا متن، شرح وحاشیہ تینوں کو مسئلہ کے مکمل اختتام تک دیکھنا چاہیے۔ کہیں ”کما قدمناہ“ یا ”کما سیجیء“ فرمایا ہو تو اسے بھی دیکھیں، اسی طرح اس مسئلہ کے اور مظان متوقعہ ہوں تو ان کی بھی مراجعت کریں۔ مثلاً: سلام کے احکام ایک تو مفسدات صلوۃ میں ”تکلم فی الصلوۃ“ کے ضمن میں ہیں، دوسرے ”الحظر والإباحۃ“ میں ”تشمیت عاطس“ کے ساتھ ذکر ہیں۔ دونوں جگہ کچھ ایسے مسائل ہیں جو دوسری جگہ میں نہیں، لہٰذا دونوں کو دیکھے بغیر واقفیت تامہ حاصل نہیں ہوتی۔ جلد بازی سے بات ادھوری سمجھنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ کتاب کے مطلوبہ مقام پر ”تقریرات رافعی“ میں کلام ہو تو اس کی بھی مراجعت کریں کہ ان کی تحقیقات بھی نہایت عمدہ ہوتی ہیں، بعض مقامات پر فتویٰ بھی ان کی تحقیق پر دیا گیا ہے، جیسا کہ آگے ”تقریرات رافعی“ کے تعارف میں آئے گا۔[1]

اس طرز پر چند مسائل کی تخریج سے کتاب سے مناسبت پیدا ہو کر استفادہ سہل ہو جاتا ہے۔ محنت کے ساتھ دعا کا بھی معمول بنائیں۔ مسئلہ کی تلاش کے وقت ”یا معلم إبراھیم علمنی“ (منقول عن شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ) کا ورد کرتے رہیں۔

---

۱ - املائی افادات از حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ۔

حوالہ دینے کا طریقہ:

۱- اگر صرف متن کی عبارت لی ہو تو شروع میں "قال فی تنویر الأبصار" یا "قال فی التنویر" آئے گا، یا پھر آخر میں "تنویر الأبصار علی هامش رد المحتار" قوسین میں لکھا جائے گا۔ اگر آپ کے پاس موجود نسخے میں متن وشرح اوپر اور حاشیہ نیچے ہو تو "تنویر الأبصار مع رد المحتار" لکھیں۔

۲- اگر شرح کی عبارت کا حوالہ دینا مقصود ہو تو شروع میں "قال فی الدر المختار" یا "قال فی شرح التنویر" یا "قال الحصکفی /قال العلائی /قال العلاء رحمه اللّٰه تعالی" آئے گا، یا پھر آخر میں "الدر المختار مع رد المحتار" لکھیں۔ درج بالا دونوں صورتوں میں صرف "تنویر الأبصار" یا صرف "الدر المختار" لکھ کر صفحہ وجلد لکھنا غلط ہوگا کیونکہ "ردالمحتار" جب ساتھ ہے تو اس پر درج صفحات اسی کے ہیں، متن وشرح کے نہیں۔ ہاں اگر متن وشرح حاشیہ سے مجرد ہیں تو ان ہی کا جلد وصفحہ لکھ سکتے ہیں۔

۳- جب حاشیہ سے عبارت لی جائے تو "قال فی الرد" (الألف واللام عوض عن المضاف إلیه) یا "قال المحقق فی الشامیة" شروع میں لکھا جاتا ہے۔ یا پھر آخر میں "ردالمحتار" یا "شامیه" لکھتے ہیں۔ اگر متن، شرح وحاشیہ تینوں سے مخلوط کر کے عبارت لی جائے، تو پہلے متن وشرح کی عبارت درج بالا طریقہ کے مطابق "قال فی التنویر وشرحه" لکھ لیں، پھر نئی سطر سے "وفی الرد" یا "وفی الشامیه" لکھ کر حاشیہ کی عبارت نقل کریں۔

پہلے وقتوں میں جب قلمی کتابیں لکھی جاتی تھیں تو ان کے صفحات پر اعداد نہ ہوتے تھے، لہٰذا جلد وصفحہ کا حوالہ نہ دیا جاتا تھا بلکہ عبارت ختم ہونے پر انتہائے عبارت کا رمز "اھـ" یا لفظ "حد" کا بحساب ابجد عدد[1] "۱۲" لکھ کر کتاب کا نام یا رمزی علامت لکھ دی جاتی تھی، زیادہ سے

۱- "ح" کا عدد آٹھ اور "د" کا چار ہے۔ مجموعہ ۱۲ ہوا۔

زیادہ فصل کا حوالہ ہوتا تھا، جیسے:

وفی الفتاوی الخیریة من الکراهیة والاستحسان: جاء فی الحدیث ......
(شامیة: ١ / ٦٦٠)

البتہ کبھی فصل میں اس مقام کی وضاحت بھی کردی جاتی تھی جہاں سے عبارت لی گئی، جیسے:وفی البزازیة قبیل کتاب الجنایات (أیضاً ٢/٢٤٦) یا"ویؤیده ما فی الذخیرة قبیل کتاب التحری" (أیضاً ١/٦٢٤)

اگر مسئلہ غیر مظان میں ہوتو مزید تعیین بھی کی جاتی تھی، جیسے:وتمام أبحاث هذه المسئلة فی البحر والنهر عند قوله: وکبر بلا مدٍّ ورکع. (أیضاً ١/ ٤٨٠)

اگر محولہ عبارت بعینہٖ نقل کی جارہی ہے تو اس کیلئے "نصه" کے الفاظ ہوتے تھے، جیسے:ثم رأیت فی معارج الدرایة ما نصه: (أیضاً ٢/٦١٧) أما ما ذکره فی کتاب الجهاد من الخانیة فی باب خراج الأرض فنصّه هکذا...... (أیضاً ٢/٣٣٢)

اگر عبارت کی تلخیص یا اس میں تغیر کی گئی ہے تو اس کے خاتمے کے بعد یوں لکھا جاتا تھا: "......اهـ بتغییر یسیر". جیسے:"قال فی الفتح: واتفقت کلمة المشایخ ......آه ملخصاً، وتمامه فیه." (أیضاً ٢/٢٣٩)

بعد میں جب طباعت کی مشینیں ایجاد ہوگئیں تو باب وفصل کے بعد جلد وصفحہ جلد لکھا جانے لگا۔ آج تک اس پر عمل ہوتا آیا ہے کہ کتاب کا نام، جلد وصفحہ، مصنف کا نام اور دیگر تفصیلات قوسین میں لکھی جاتی ہیں اور مصنَّف کا ذکر پہلے اور مصنِّف کا بعد میں جاتا ہے۔

موجودہ دور میں جب سے تحقیق کاری اور مقالہ نویسی کا نیا طرز رائج ہوا ہے حوالہ دینے کا ایک نیا انداز اپنایا گیا ہے۔ اس کی ترتیب یہ ہوتی ہے:

١- سب سے پہلے مصنف کی نسبت، لقب یا تخلص جس سے بھی مشہور ہوں، پھر نام یا کنیت جو بھی معروف ہو۔

۲- اس کے بعد کتاب کا مکمل نام

۳- جلد وصفحہ

٤- مطبع وسن طباعت

مثال:

۱- ابن قدامه، المغنی:٧/ ٥٢، دار المنار ١٣٦٧ھ

۲- ابن رشد، بداية المجتهد:٢/ ٦٨، مصطفے البانی

۳- ابن القیم، زادالمعاد: ٢/ ٢٣٨، ١٣٦٩ھ

٤- المطرزی، ابوالفتح، المغرب فی ترتیب المغرب: ١/ ١٦٥، لجنة مصر ١٣٢٤ھ

٥- سرخسی، شمس الأئمة، المبسوط: ٦/ ٤٣٢١، دکن ١٣٢٨ھ

٦- الشیرازی، أبو إسحق، المهذب: ١٧٣، مطبعة السعادة مصر ج ٢، ص ٧١، ١٣٢٤ھ،عیسی البابی مصر ١٣٢٧ھ

اگر کوئی اسی طرز پر شامیہ کا حوالہ لکھنا چاہے تو اسے یوں لکھنا ہوگا:

شامی، ابن عابدین، ردالمحتار ۳/ ۳۱۳، دارالفکر بیروت، ۱۳۸٦ھ

اس طرز کا حوالہ حاشیے میں یا مضمون کے آخر میں دیا جاتا ہے، فتویٰ میں اس کو تا حال رواج نہیں، لیکن یہ طرز سہل اور مفید ہے کہ پڑھنے والا مسلسل عبارت پڑھتا چلا جاتا ہے۔ اگر چاہے تو حاشیہ میں حوالہ دیکھ لے ورنہ عبارت کی روانی متاثر نہیں ہوتی، اس لیے اس طرز کو فتویٰ میں بھی رواج دیا جاسکتا ہے۔

قرة عيون الأخيار
تكملة رد المحتار

شامیہ کے نسخوں کے ساتھ ایک جلد بنام "قرة عيون الأخيار تكملة رد المحتار" ملتی ہے۔ یہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند ارجمند کی تصنیف کردہ ہے۔ ان کا نام محمد علاء الدین بن محمد امین بن عمر تھا۔ یہ دمشق کے ممتاز علماء میں سے تھے۔ جس طرح سلطان اورنگزیب عالمگیر نے مجلس علماء سے "فتاوی عالمگيريه" کی تصنیف کا عالی شان کام کروایا، اس طرح خلافت عثمانیہ کے دور میں سلاطین آل عثمان نے "المجلة الشرعية للأحكام العدلية" کے نام سے اسلامی عدالتوں کیلئے ایک مجموعہ تیار کروایا۔ اس کی تیاری میں عالم اسلام کے ممتاز ترین علماء کی خدمات حاصل کی گئیں، ان میں سے ایک علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند بھی تھے۔ یہ اپنے والد کی اکلوتی نرینہ اولاد تھے۔ علامہ نے ان کا نام صاحب "الدر المختار" کے نام پر "علاء الدين" رکھا تھا۔ انہوں نے اپنے والد کے زیر سایہ تعلیم و تربیت حاصل کی تھی۔ جب علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے رد المحتار کی تسوید سے فارغ ہو کر تبییض شروع کی تو ابھی کتاب القضاء کے مسائل شتی تک پہنچے تھے کہ انتقال فرما گئے۔ ان کے نسخے پر موجود حواشی کی تبییض ان کے صاحبزادے نے مکمل کی، اس کے بعد انہوں نے تكملة رد المحتار کے نام سے "شاميه" پر کچھ حواشی اور تعلیقات لکھیں۔ اس کے شروع میں انہوں نے اپنے والد کے حالات زندگی تفصیل کے ساتھ نقل کئے ہیں جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس تکملہ کا سبب تصنیف بیان کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

أما بعد: فيقول فقير رحمة ربه، وأسير وصمة ذنبه، محمد علاء الدين بن

السيد محمد أمين بن السيد عمر عابدين، غفر الله تعالى ذنوبهم، وملأ من زلال العفو ذنوبهم، آمين: إنه لمّا سبقت الإرادة الإلٰهية، والمشية الرحمانية، بوفاة سيدى الوالد قبل إتمام تبييض حاشية "رد المحتار على الدر المختار، شرح تنوير الأبصار" فإنه رحمه الله تعالىٰ ونور ضريحه، وجعل أعلى الجان ضجيعه، لما وصل إلى أثناء "شتى القضاء" من هذا الكتاب، اشتاق إلى مشاهدة ربّ الأرباب، فنقل من دار الغرور إلى جوار مولاه الغفور، وكان رحمه الله تعالىٰ بدأ أولا فى التسويد من الأول إلى الآخر، ثم شرع فى التسو التبييض، فبدأ أولاً من "الإجارة" إلى الاخر، ثم من أوّل الكتاب إلى انتهاء هذا التحرير الفاخر، وترك على نسخته "الدر" بعض تعليقات، وتحريرات، واعتراضات قد كاد تداول الأيدى أن يذهبها، لعدم من يذهبها مذهبه، وكان قد جرى الأمر بطبعها فى بولاق المصرية، فجمعتها برمتها بدون زيادة حرف بالكلية، وأرسلتها فطبعت ثمة؛ حرصا على فوائدها الجمة، وكان كثيرا ما يخطر لى زيادتها مع ضم تحريرات، وبعض فروع وتقريرات، لكن لم تساعد الأقدار، لاسيما مع شغل الأفكار، وقلة البضاعة فى هذه الصناعة، حتى سافرت للآستانة العلية، دار الخلافة السنية، عام خمس وثمانين بعد المأتين والألف، من هجرة من تم به الألف، وزال به الشقاق والخلف، صلى الله تعالى عليه وسلم وعلى آله وصحبه ألفاً بعد ألف، ووظفت عضوا فى الجمعية العلمية، التابعة لديوان أحكام العدلية لجمع المجلة الشرعية، تحت رياسة حضرة الوزير المعظم، والمشير المفخم، مدير أمور جمهور الأمم، الجامع بين مرتبتى العلم والعلَم، والحائز لفضيلتى السيف والقلم، صاحب الدولة أحمد جودت باشا، بلغه الله تعالىٰ من الخيرات ماشاء، وأسعد أيامه وحرسها، وألقى محبته فى القلوب وغرسها، ولازالت أعلام دولته مبتسمة الثغور، وأرقام رفعته منتظمة السطور على مدى الدهور، آمين.

وبعد إقامتی مدة تقرب من ثلاث سنین قدمت الاستعفاء، لما فی قلبی من الرمضاء، من فراق الأوطان، والأهل والخلان، فأمرنی قبل سفری من أمرُه مطاع، واجب الاستماع، أن أتمم نقصها، وأتلافی ثلمها، حین وصولی إلی الوطن، وقراری بالسکن.

فلما رجعت بعد ثلاث سنین من سفری إلی وطنی دمشق الشام، ذات الثغر البسام، استخرت اللّٰه تعالی المرة بعد المرة، والکرة بعد الکرة، فی تکملة الخرم، معتمدا علی اللّٰه تعالیٰ فی الحزم، ومتوکلا علیه فی سائر الأمور فی أن یحفظنی من الخطاء والخلل، والهفوات والزلل، ومتوسلا إلیه بنبیه النبیه المکرم، صلی اللّٰه تعالی علیه وسلم، وبأهل طاعته من کل مکان علی معظم، وبقدوتنا الإمام الأعظم، أن یسهل علیّ ذلك من إنعامه، ویعیننی علی إکماله وإتمامه، وأن یعفو عن زللی، ویتقبل منی عملی، ویجعل اللّٰه ذلك خالصاً لوجهه الکریم، ﴿یوم لاینفع مال وّلا بنون، إلا من أتی اللّٰه بقلب سلیم.﴾ وینفع به العباد فی عامة البلاد، من ساکن وباد.(۱)

یہ تکملہ "کتاب القضاء" کے مسائل شتی سے لے کر "کتاب الهبة" کے اختتام تک ہے۔ مصنف اس کی تحریر سے ۱۰/رجب ۱۲۹۰ھ بروز منگل فارغ ہوئے۔

۱-تکملۂ ردالمحتار:٤، ٥

التحرير المختـــــار

المعروف بـ "تقريرات الرافعي على الدر المختار"

"رد المحتار" کے ساتھ آخری جلد ان تعلیقات کی ہوتی ہے جو العلامۃ الجلیل عبدالقادر ابن مصطفیٰ الباری الرافعی (پیدائش ۱۲۴۸ھ/ وفات ۱۳۰۵ھ) کی تحریر کردہ ہیں۔ یہ مصر کے مفتیٔ اعظم اور اپنے وقت میں فقہ حنفی کے امام تھے۔ محکمہ شرعیہ قانون کی مجلس علمی کے رئیس تھے اور "أبو حنيفة الصغير" کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنے پاس موجود "ردالمحتار" کے نسخے پر مطالعہ کے دوران حواشی وتعلیقات لکھے تھے اور آخر عمر تک اس پر اضافہ کرتے رہے تھے۔ ان کے صاحبزادے نے ان کی تجرید کی اور اپنے والد ماجد کی وفات کے بعد ان کو شائع کیا، جیسا کہ وہ خطبے میں فرماتے ہیں:

"وبعد: فيقول العبد الفقير إلى مولاه الغنى محمد رشيد الرافعى: إن سيدى وأستاذى وشيخى وملاذى ووالدى المغفور له العلامة الشيخ عبد القادر الرافعى مفتى الديار المصرية، لما قرء عدة مرات حاشية العلامة السيد محمد أمين الشهير بابن عابدين، المسماة "ردالمحتار" ووقف فى كل مرة منها على غوامضها وأسرارها، وكشف عنها حجب الخفاء، حتى أضاء ت لديه بأنوارها، وعلق عليها تقريرات هو غاية غاياتها، ومفتاح مغلقاتها، أنفق فيه شطر العمر بين مراجعة وتنقيب، وإيضاح وتقريب، ونظر وتحرير، وبحث وتقرير، ولما رأيت منه هذه العناية، استأذنته رحمه اللّٰه تعالىٰ فى تجريده من هوامش نسخته "ردالمحتار". فأذن لى، وقابلته معه بعد

تجريده، فكان بعد ذلك عنده في موضع حاجة النفس، لم يزل يتعهده بالنظر والتنقيح، حتى كان آخر عهده به اليوم الآخر من شهر شعبان سنة ۱۳۲۳هـ قبل وفاته ببضعة أيام، وقد فرغ يومئذ من إعادة النظر فيه، وسمّاه "التحرير المختار" وهو إلهام منه تعالى. ولم يشاء رحمه الله أن يخرج تقريره للناس في حياته مع شدة الحاجة إليه، وتوارد الطلاب عليه، تواضعاً منه في جانب الله، وحرصاً على فائدة يجدها فيزيد بها تلك الفرائد، وهذا غاية البر بالناس فيما اؤتمن عليه من العلم، وقد رأيت من واجب حقه عليّ أن أظهر هذه الثمرة بعد أن حان قطافها، وعذب ارتشافها، وأنا أرجو أن أكون قد أديت الأمانة إلى أهلها من العلماء، وقمت ببعض ما يجب على أضعف الأبناء لأبرّ الآباء، وما توفيقي إلا بالله، عليه توكلت وإليه أنيب.(۱)

علامہ رافعی کی یہ تقریرات انتہائی پرمغز، عمدہ اور نادر ہیں۔ بعض مقامات پر ان کو دیکھے بغیر فتویٰ نہیں دیا جاسکتا، لہٰذا مفتی اس کتاب سے بے نیاز نہیں، مثلاً: کفارہ یمین میں تداخل کی بحث میں درمختار اور شامیہ میں ثبوت تداخل کا قول ہے، یہ اوسع وایسر تو ہے، لیکن ارجح واشہر عدم تداخل کا ہے، جو علامہ رافعی نے "فتح القدير" اور "عالمگيريه" سے نقل کیا ہے۔ (دیکھیں ردالمحتار: ج ۳ اول كتاب الأيمان، مطلب تتعدد الكفارة بتعدد اليمين اور اس پر تقريرات رافعى) اسی طرح ادخال صبيان في صفوف الرجال کے مسئلے میں ان کی تحقیق پر فتویٰ دیا جاتا ہے۔ (دیکھیے: احسن الفتاوی: ۲۸/۳ اور التحریر المختار: ۷۳/۱)

هذا آخر ما أردنا كتابته في هذا المقام، وصلى الله على سيدنا محمد خير الأنام، الذي هو للأنبياء ختام، وعلى آله الكرام، وأصحابه العظام، ومن تبعهم بإحسان، إلى يوم يرث الله فيه الأرض ومن عليها من الأنام.

۱- خطبة تقريرات الرافعي: ۳،۲

کتابیات رد المحتار

ان سو سے زائد کتابوں کا مختصر تعارف جن کا ''ردالمحتار'' میں بکثرت حوالہ دیا جاتا ہے۔

۱- الاختیار لتعلیل المختار:

علامہ ابوالفضل، مجد الدین، عبداللہ بن محمود بن مودود الموصلی متوفی ۶۸۳ھ کی تصنیف ہے۔ یہ معتمد کتاب علماء وطلبہ میں متداول ہے۔ مطبوعہ ہے۔ اور یہ خود مصنف کے متن ''المختار للفتوی'' کی شرح ہے جو فقہ حنفی کے متون اربعہ میں شمار ہوتا ہے۔

۲- الاختیارات فی الفقه:

اس کے مصنف ابوسعید خلف بن ایوب عامری بلخی متوفی ۲۲۰ھ ہیں۔

۳- الأسرار:

امام ابوزید عبیداللہ بن عمر دبوسی کی تصنیف ہے۔ یہ ان کی مشہور ترین تصنیفات میں شمار ہوتی ہے۔

٤- الأشباه والنظائر:

دیکھیے: ابن نجیم۔

٥- الأمالی فی الفقه:

امام حسن بن منصور المعروف بقاضی خان کی تصنیف ہے۔ ان کی دیگر کتابیں یہ ہیں: ''شرح الجامع الکبیر''، ''شرح الجامع الصغیر''، ''الواقعات فی الفروع''. یہ ۵۵۲ھ میں فوت ہوئے۔ ''أمالی فی الفقه'' کے نام سے ایک تصنیف امام عبدالرشید بن ابی حنفیہ والوالجی کی بھی ہے۔

٦- إمداد الفتّاح شرح نور الإیضاح:

مشہور فقیہ علّامہ حسن بن عمار بن علی شرنبلالی کی تصنیف ہے۔ جو ۱۰۶۹ھ میں فوت

ہوئے۔مزید دیکھیے :شر نبلالی

۷- أنفع الوسائل إلى تحرير المسائل:

فتاوی طرطوسیۃ سے بھی معروف ہے، از قاضی القضاۃ نجم الدین ابراھیم بن علی بغدادی متوفی ۷۵۸ھ۔ آٹھویں صدی کے مشہور فقیہ اور مصنف ہیں جبکہ کل عمر صرف ۳۸ سال تھی۔ ”وفیات الأعیان“ آپ ہی کی کتاب ہے۔

۸-الإيضاح:

اس کے مصنف علامہ رکن الدین، عبد الرحمٰن بن محمد الکرمانی متوفی ۵۲۲۰ھ ہیں۔ ایضاح ان کی ایک دوسری کتاب ”تحریر“ کی شرح ہے، جوانہوں نے ”جامع کبیر“ کی شرح کے طور پر لکھی تھی۔

۹- البحر الذخار:

فقیہ احمد بن محمد بن اقبال کی تالیف ہے۔ یہ درحقیقت علامہ حدادی کی شرحِ قدوری ”السراج الوھاج“ کی تجرید وتہذیب ہے۔

۱۰- البحر الرائق:

”کنز الدقائق“ کی شہرہ آفاق شرح از علامہ زین الدین ابراھیم بن نجیم مصری متوفی ۹۷۰ھ۔”البحر الرائق“ کے معنی ہیں: ”صاف سمندر“ یہ آٹھ جلدوں میں ہے۔”کتاب الإجارۃ، باب الإجارۃ الفاسدۃ“ تک انہوں نے لکھی، ان کے انتقال کے بعد محمد بن حسین طوری نے تکمیل کی۔ آٹھویں جلد تکملہ ہے۔

۱۱- بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع:

یہ علامہ علاءالدین سمرقندی کی ”تحفۃ الفقھاء“ کی شرح ہے جو علامہ علاءالدین، ابوبکر بن مسعود الکاسانی المتوفی ۵۸۷ھ نے لکھی ہے۔ سات جلدوں میں مطبوعہ ہے۔ فقہ حنفی میں اس کی نظیر نہیں ہے۔ ان کے شیخ علامہ سمرقندی رحمہ اللہ نے اس شرح کی بنا پر اپنی صاحبزادی کا نکاح ان

سے کردیا باوجودیکہ اس نکاح کے لیے شاہزادوں کے پیغامات موجود تھے۔

۱۲- بداية المبتدى فى الفروع:

علامہ ابوالحسن علی بن ابی بکر المرغینانی کی تصنیف ہے۔ یہ ان کا وہی متن ہے جس کی شہرہ آفاق شرح انہوں نے "هدايه" کے نام سے لکھی۔ آپ ۵۹۳ھ میں فوت ہوئے۔

۱۳- البرهان شرح مواهب الرحمن:

دو جلدوں میں ہے۔ یہ متن وشرح دونوں علامہ ابراہیم بن موسیٰ طرابلسی (متوفی ۹۲۲ھ) کی تحریر کردہ ہیں۔

١٤-بزازية:

حافظ الدین محمد بن شہاب بن یوسف الکردری کی تصنیف ہے جو"بزازی" کی نسبت سے مشہور ہیں۔ اس کتاب کو "الـوجيـز" کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ (متوفی ۸۲۷ھ) "فتاوی عالمگيريه" کے حاشیہ پر از جلد ٤ تا ٦ طبع ہوئی ہے۔

۱۵- التبيين:

اس کا پورا نام "تبيين الحقائق شرح كنزالدقائق" ہے۔ "كنز" کی یہ اہم ترین شرح علامہ فخر الدین، ابو محمد عثمان بن علی زیلعی (متوفی ۷۴۳ھ) کی لکھی ہوئی ہے۔ اور فقہ حنفی کی مایہ ناز کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔

١٦- التتار خانية:

علامہ عالم بن علاء الحنفی الدهلوی (متوفی ٧٨٦ھ) کے فتاوی کے مجموعے کا نام ہے۔ اس کا ایک نام "زاد المسافر فى الفروع" بھی ہے۔ اس میں انہوں نے ان کتابوں کے مسائل جمع کئے ہیں: "المحيط البرهانى"، "الذخيرة"، "ظهيرية"، "خانية". امیر تتارخان کی طرف منسوب ہے جو مصنف کے دوست تھے۔ یہ کتاب فقہ حنفی کا انسائیکلوپیڈیا شمار ہوتی ہے۔ پانچ جلدیں طبع ہو چکی ہیں۔ باقی مخطوطہ ہے۔

۱۷- التتمہ:

پورا نام "تتمۃ الفتاوی" ہے جو "المحیط البرھانی" کے مصنف علامہ محمود بن احمد برھانی (متوفی ٦١٦ھ) کی تصنیف ہے۔

۱۸- تجرید:

امام احمد بن محمد قدوری (متوفی ٤٢٨ھ) کی ضخیم تصنیف ہے۔فقہ حنفی میں "تجرید" کے نام سے ایک اور کتاب بھی معروف ہے جو علامہ محمد بن شجاع ثلجی کی تصنیف ہے۔

۱۹- تجنیس:

صاحب "ھدایہ" امام ابوالحسن علی بن ابی بکر مرغینانی کی مشہور تصنیف ہے۔اس میں انہوں نے متاخرین کے استنباط کردہ وہ مسائل جمع کئے ہیں جو متقدمین سے مروی نہیں تھے۔ بعد میں انہوں نے اس میں اضافہ کیا اور اس کا نام "مزید" رکھا۔لیکن کتاب "تجنیس" کے نام سے ہی مشہور ہے۔

۲۰- تحریر:

یہ "الاختیار شرح المختار" کی تلخیص ہے، جو علامہ احمد بن علی دمشقی (متوفی ٧٨٢ھ) نے کی۔

۲۱- تحفۃ الفقہاء:

علامہ علاء الدین سمرقندی کی تصنیف ہے، یہ ابواللیث سمرقندی کے علاوہ ہیں۔یہ وہی متن ہے جس کی شرح علامہ کاسانی نے بدائع الصنائع کے نام سے لکھی تو صاحب متن نے اپنی صاحبزادی کو ان سے بیاہ دیا اور اس شرح کو نکاح کا مہر قرار دیا۔

۲۲- التصحیح:

علامہ قاسم بن قطلو بغا بن عبد اللہ مصری (متوفی ٨٧٩ھ) کی تصنیف ہے۔کتاب کا پورا

نام ”التصحیح و الترجیح للقدوری“ ہے۔اس میں انہوں نے ”قدوری“ کے مختلف فیہ مسائل کی تصحیح کی ہے۔

۲۳- التعریفات:

شیخ اجل علامہ سید علی بن محمد جرجانی کی مشہور تصنیف،جس میں انہوں نے مختلف فنون کی تعریفات جمع کی ہیں۔۸۱٦ھ میں فوت ہوئے۔

۲٤- التقریر فی شرح الجامع الکبیر:

علامہ رضی الدین، ابراھیم بن سلیمان الحموی، المنطقی، الحنفی (متوفی ۷۳۲ھ) کی لکھی ہوئی کتاب ہے جس میں انہوں نے امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ”الجامع الکبیر“ کی شرح کی ہے۔

۲۵- التوضیح:

”مقدمه ابی اللیث“ کی شرح ہے جو مصطفیٰ بن زکریا قرمانی (متوفی ۸۰۹ھ) کی تحریر کردہ ہے۔

۲٦- توفیق العنایة فی شرح الوقایة:

زین الدین، جنید بن شیخ سندل بغدادی حنفی کی تصنیف ہے۔

۲۷- الجامع الصغیر:

امام محمد بن حسن شیبانی کی مایۂ ناز تصنیف ہے۔یہ ۱۵۳۲ مسائل پر مشتمل ہے۔امام ابو یوسف باوجود اپنی جلالت شان کے اسے سفر وحضر میں ہمیشہ ساتھ رکھتے تھے۔اسلامی سلطنتوں کے دور میں احناف جب تک اس کا امتحان نہ لے لیتے کسی کو عہدہ قضاء پر فائز نہ کرتے تھے۔اس کی بہت سی شرحیں لکھی گئی ہیں جن میں سے سرخسی، ابو جعفر ھنداوی اور قاضی خان کی شرحیں مشہور ہیں۔بارہا طبع ہو چکی ہے۔

امام محمد رحمہ اللہ تعالی کی جن کتابوں کے نام کے ساتھ لفظ "صغیر" ہے وہ بہت آسان ہیں، ہر کوئی پڑھ کر اس کا اندازہ کرسکتا ہے اور جن کتابوں کے نام میں لفظ "کبیر" ہے وہ اس قدر دقیق ہیں کہ جلیل القدر ائمہ بھی مشکل ہی سے حل کر پاتے ہیں۔ "جامع کبیر "مطبوعہ موجود ہے جس کا جی چاہے پڑھ کر اندازہ کرے۔ دوسرا فرق صغیر اور کبیر میں یہ ہے کہ "صغیر" کے نام سے موسوم کتابوں پر صاحبین رحمہما اللہ کا اتفاق ہے جب کہ "کبیر" سے موسوم کتابیں امام محمد رحمہ اللہ نے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کو ملاحظہ کے لئے پیش نہیں فرمائی تھیں۔

۲۸- جامع الفصولین:

علامہ بدر الدین محمد بن اسرائیل المعروف بابن قاضی ساوہ (متوفی ۸۲۳ھ) کی مشہور کتاب ہے، جسے انہوں نے چالیس فصول پر تقسیم کر کے لکھا ہے۔ معاملات سے متعلق ہونے کی بناء پر قاضیوں اور مفتیوں کے مابین متداول ہے۔

۲۹- الجامع الکبیر:

امام محمد بن حسن شیبانی (متوفی ۱۸۷ھ) کی یادگار تصنیف، حنفیہ نے اس کی بہت سی شروح لکھیں، جن میں سے فخر الاسلام علی بن محمد بزدوی اور قاضی ابو زید دبوسی کی شروحات مشہور ہیں۔

۳۰- جامع المضمرات والمشکلات:

قدوری کی شرح ہے از صوفی یوسف بن عمر کادوری متوفی ۸۳۲ھ۔ آپ کی شہرت "نبیرہ شیخ عمر" کے نام سے تھی۔

۳۱- جوامع الفقہ:

"فتاوی عتابیہ" کے نام سے مشہور ہے۔ علامہ احمد بن محمد العتابی (متوفی ۵۸۶ھ) کی تصنیف ہے۔

۳۲- الجوهرة النيرة:

یہ "قدوری" کی شرح "السراج الوهاج الموضح لكل طالب و محتاج" کی تلخیص ہے۔اصل شرح اوراس کی تلخیص دونوں امام ابوبکر بن علی الحدادی (متوفی ۸۰۰ھ کے آس پاس) کی علمی کاوشیں ہیں جو یمن کے علاقہ عبادیہ کے رہنے والے تھے۔انہوں نے فقہ حنفی میں بہت سی بڑی اور مفید تصنیفات کی ہیں۔اصل کتاب آٹھ جلدوں میں اور تلخیص دو جلدوں میں ہے۔

۳۳- الحاوی فی مختصر الطحاوی:

علامہ محمد بن احمد الاسبیجابی کی تالیف ہے جو چھٹی صدی ہجری کے اواخر میں فوت ہوئے۔

۳۴- الحاوی القدسی:

اس کے مصنف قاضی جمال الدین علامہ احمد بن محمد بن نوح قابسی الغزنوی (متوفی ۶۰۰ھ کے آس پاس) ہیں۔یہ کتاب انہوں نے بیت المقدس میں تصنیف کی،اس لئے کتاب کو "قدسی" کہتے ہیں۔تینوں غیر مطبوعہ ہیں۔

ملاحظہ: فقہ حنفی میں دو حاویاں اور بھی ہیں:

(۱) "الحاوی الحصیری" از ابوبکر محمد بن ابراهیم بن انوش حصیری (متوفی ۵۰۰ھ) آپ شمس الائمہ سرخسی کے شاگردوں میں سے تھے۔

(۲) الحاوی الزاهدی: اس کے مصنف مشہور معتزلی العقیدۃ حنفی الفروع فقیہ علامہ نجم الدین مختار بن محمود زاهدی (متوفی ۶۵۸ھ) ہیں "قنية" اور "مجتبیٰ" بھی انہی کی تالیفات ہیں جن کا تعارف آگے آئے گا۔ان کتابوں میں منقول مسئلہ جب تک دوسری کتابوں سے مؤید نہ ہو معتبر نہیں۔

۳۵- الحقائق:

از ابوالحامد محمود بن محمد افسنجی ،لؤلؤی، بخاری۔یہ کتاب علامہ نسفی کی فقہ میں ایک منظوم

تالیف کی شرح ہے جس کا پورا نام مصنف نے "حقائق المنظومہ" رکھا۔ یہ شرح علماء میں مقبول اور متداول ہے۔ آپ نے ۶۷۱ھ میں وفات پائی۔ یہ کتاب سات سال سے زیادہ عرصے میں عید الاضحیٰ ۶۶۶ھ میں مکمل کی۔ اس کتاب کا مخطوطہ مدینہ منورہ میں ہے۔

۳۶- حلية المجلّى شرح منية المصلى:

یہ نویں صدی کے مشہور حنفی عالم محمد بن محمد الشہیر ابن امیر حاج حلبی کی تالیف لطیف ہے۔ "حلیہ" کے معنی زیور اور "مجلّی" میدان میں آگے رہنے والا گھوڑا، "المصلّی": دوڑ میں دوسرے نمبر پر آنے والا گھوڑا۔ "منية المصلى" کا تعارف آگے آتا ہے۔ آپ ۸۷۹ھ میں فوت ہوئے۔

۳۷- خانية:

امام حسن بن منصور اوز جندی المعروف بقاضی خان کی مشہور تالیف، جسے "فتاویٰ قاضی خان" بھی کہتے ہیں۔ آپ ۵۹۲ھ میں فوت ہوئے۔ اس کتاب میں کثیرۃ الوقوع مسائل ذکر کئے گئے ہیں اور مختلف اقوال میں سے ایک یا دو قول ذکر کرتے ہیں اور جو راجح ہو اسے مقدم کرتے ہیں۔ فتاوی عالمگیریہ کے ہامش پر مطبوعہ ہے۔

۳۸- خزانة الأكمل:

چھ جلدوں پر مشتمل اس کتاب میں حنفیہ کے اکثر اصول کو جمع کیا گیا ہے۔ فقیہ ابو یوسف بن علی جرجانی کی تالیف ہے۔

۳۹- الخلاصة:

پورا نام "خلاصة الدلائل فی تنقیح المسائل" ہے۔ یہ درحقیقت "قدوری" کی شرح ہے جو علامہ علی بن احمد رازی (متوفی ۵۹۸ھ) نے تحریر کی۔ یہ شرح مختصر اور مفید ہے۔

٤٠- خلاصة الفتاوىٰ:

فقہ حنفی کی معتبر ومعتمد علیہ کتاب ہے جس کو "الواقعات فی الفروع" اور "خزانة الأكمل" کی مدد سے تالیف کیا گیا۔ "خزانة" کا تعارف گذر گیا اور "واقعات" کا آگے آئے گا۔ اس کے مؤلف علامہ طاہر بن احمد (متوفی ٥٤٢ھ) ہیں۔ یہ کتاب روایات کی جامع اور زوائد سے خالی ہے اور اس میں مسائل کے مراجع ومظان کا ذکر ہے اور ہر کتاب کی انتہا پر اجناس اور فصول کی فہرست بھی استفادے میں سہولت کی خاطر موجود ہے۔ ہندوستان سے چار جلدوں میں طبع ہوئی ہے۔

٤١- خلاصة النهاية فی فوائد الهداية:

از قاضی علاء الدین محمود بن عبداللہ بن صاعدی، الحارثی، المروزی، المتوفی ٦٠٦ھ۔

٤٢- خيرية:

علامہ خیر الدین بن احمد بن علی فاروقی ایوبی رملی متوفی ١٠٨١ھ کے فتاوی مشہور کا مجموعہ جو دو جلدوں میں طبع ہو چکا ہے۔ اسے آپ کے صاحبزادے محی الدین بن خیر الدین (متوفی ١٠٧١ھ) نے جمع کرنا شروع کیا تھا۔ تکمیل سے پہلے ان کی وفات ہوگئی تو شیخ ابراھیم بن سلیمان جینینی متوفی ١١٠٨ھ نے مکمل کیا۔ فلسطین کے مشہور شہر رملہ کے رہنے والے ہیں۔

٤٣- الدراية:

"هداية" کی شروح میں سے ایک شرح، جس کے مصنف محمد بن مبارک شاہ ہروی متوفی ٩٥٤ھ ہیں۔ واضح ہو کہ "هداية" کی ایک شرح "معراج الدراية" کے نام سے ہے جس کا تذکرہ آگے آرہا ہے۔

٤٤- درر البحار:

از شمس الدین محمد بن یوسف القونوی متوفی ٧٨٨ھ۔ یہ فقہ حنفی کے متون میں سے ہے۔ اس کی ایک شرح علامہ قاسم بن قطلو بغا نے لکھی ہے اور ایک علامہ شمس الدین محمد بن محمد بخاری

نے ،مؤخر الذکر کا نام "غرر الأذكار شرح درر البحار" ہے۔مخطوطہ ہے۔

٤٥- درر البحار الزاهرة فى نظم البحار الذاخرة:

علامہ بدرالدین العینی المتوفی ۸۵۵ھ کی تصنیف ہے۔

٤٦- درر الحكام فى شرح غرر الأحكام:

متن اور شرح علامہ دونوں محمد بن فراموز الشهير بملا خسرو (متوفی ۸۸۵ھ) کی مشہور تصنیفات میں سے ہیں۔دوجلدوں میں چھپی ہوئی ہے۔

٤٧- الذخيرة:

پورانام "ذخيرة الفتاوى" ہے،جو "ذخيرة برهانية" کے نام سے مشہور ہے۔یہ محمود بن احمد البرهانی کی تالیف ہے جس میں انہوں نے اپنی مشہور کتاب "المحيط البرهانى" کا اختصار کیا ہے۔مصنف ٦١٦ھ میں فوت ہوئے۔دونوں کتابیں تاحال مخطوطہ ہیں۔

٤٨- الرد على سيرة الأوزاعى:

امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف ہے۔اس میں امام موصوف نے اہل حرب،اہل ذمہ،مرتدین اور باغیوں کے ساتھ معاملات پر کلام کیا ہے۔علامہ ابوالوفاء افغانی نے اس پر تعلیق لکھی ہے اور راویوں کے تراجم تخریج کئے ہیں۔

٤٩- رسالة فى الإسطرلاب:

شیخ زین الدین عبدالرحمٰن،المزی،الحنفی کا علم فلکیات میں رسالہ ہے،جو دس فصول پر مشتمل ہے۔

٥٠- زاد الفقهاء:

علامہ محمد بن احمد اسیجابی کی تصنیف ہے،ان کی ایک تصنیف "الحاوى فى مختصر الطحاوى" کا تذکرہ گذرا ہے۔چھٹی صدی ھجری کے آخر میں فوت ہوئے۔

۵۱- زیادات:

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف، جو فقہ حنفی کی "الأمهـــات الستة" میں شمار ہوتی ہے۔ "زیادات" جامع کبیر کا ضمیمہ ہے اور اس کا ضمیمہ ہے "زیـادات الزیادات". یہ دونوں کتابیں نہ اب تک طبع ہوئی ہیں اور نہ ہی ان کے قلمی نسخوں کا پتہ چلا ہے، البتہ "زیـادات الـزیادات" کی دو شرحیں ایک علامہ سرخسی کی اور دوسری علامہ ابونصر عتابی کی، علامہ ابوالوفاء افغانی کی تصحیح کے ساتھ حیدرآباد سے طبع ہو چکی ہیں۔

۵۲- السراج الوهاج الموضّح لكل طالب و محتاج:

از امام ابوبکر بن علی یمنی الحدادی الزبیدی (متوفی ۸۰۰ھ کے آس پاس) کی لکھی ہوئی ہے۔ یہ "قـــدوری" کی مبسوط شرح ہے جو تین جلدوں میں ہے۔ مصنف نے اس کی تلخیص "الجوهرة النيرة" کے نام سے کی ہے۔

۵۳- السراجية:

علم میراث کی مشہور کتاب ہے، جس کے مصنف علامہ سراج الدین محمد بن محمد سجاوندی ہیں۔

۵۴- السير الصغير:

از امام محمد بن حسن شیبانی رحمۃ اللہ علیہ، یہ کتاب آسان ہونے کی وجہ سے امام اہل شام علامہ اوزاعی کی نظر میں نہ جچی تو انہوں نے فرمایا: "مـا لأهـل الـعـراق و التصنيف فـی هذا الباب؛ فإنه لاعلم لهم بالسير". اس پر امام محمد رحمہ اللہ نے السیر الکبیر جیسی معرکۃ الآرا کتاب تصنیف فرمائی۔

۵۵- السير الكبير:

از امام محمد بن حسن شیبانی رحمۃ اللہ علیہ، اسے پڑھ کر امام اوزاعی نے امام محمد رحمۃ اللہ کے علم وفن کا لوہا مان لیا تھا۔ فرمایا: "لو لا ماضمنه من الأحاديث لقلت إنه يضع العلم

من نفسه".

"سیر صغیر" اور "سیر کبیر" نہ اب تک طبع ہوئی ہیں اور نہ ہی ان کے مخطوطات کا کچھ پتہ ہے۔ البتہ امام سرخسی رحمہ اللہ کی شرح چار جلدوں میں طبع ہوگئی ہے، مگر اس میں اصل کتاب کا مکمل متن موجود نہیں ہے، کیونکہ علامہ سرخسی رحمہ اللہ نے یہ شرح جیل میں بغیر کتابوں کی مراجعت کے لکھوائی تھی۔

٥٦- شرح الجامع الصغير:

از فخر الاسلام علی بن محمد بزدوی متوفی ٤٢٢ھ

٥٧- شرح الجامع الصغير:

از احمد بن محمد عتابی بخاری متوفی ٥٨٦ھ

٥٨- شرح درر البحار:

از علامہ قاسم بن قطلو بغا بن عبداللہ مصری متوفی ٨٧٩ھ

٥٩- شرح الطحاوی:

اس سے مراد "شرح معانی الآثار" (طحاوی شریف) ہے۔ امام اجل ابو جعفر احمد بن محمد بن سلامۃ طحاوی ازدی متوفی ٣٢١ھ کی مایہ ناز تصنیف ہے۔

٦٠- شرح مجمع البحرين:

از شمس الدین محمد بن یوسف قونوی متوفی ٧٨٨ھ

٦١- شرح مجمع البحرين:

از علامہ عبداللطیف بن عبدالعزیز بن امین الدین المعروف بابن مَلک متوفی ٨٠١ھ کی تالیف ہے، "شرح ابن ملك" کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ مصنف کی دیگر مشہور کتابوں میں "وقاية" اور "منار" کی شروحات شامل ہیں۔

٦٢- شرح مختصر القدوری:

از امام ابونصر احمد بن محمد بن محمد متوفی ۴۷۴ھ کی مشہور شرح ہے۔ مصنف "اقطع" کے لقب سے مشہور تھے۔

٦٣- شرح منظومة ابن وهبان:

مشہور حنفی مصنف علامہ حسن بن عمار بن یوسف شرنبلالی متوفی ۱۰٦۹ھ کی تالیف ہے۔ الدرالمختار میں اس کا بکثرت حوالہ آتا ہے خصوصاً ہر باب کے آخر میں فروع متفرقہ ذکر کرنے بعد منظوم مسائل کے ذکر کے وقت۔

٦٤- شرح المنية:

اس سے علامہ ابن امیر حاج کی کتاب "حلية المجلّى" مراد ہوتی ہے۔ دیکھیے: حلية المجلّى.

٦٥- شرح الهداية للعينى:

علامہ بدرالدین عینی متوفی ۷۵۵ھ کی "بناية شرح هدايه" مراد ہوتی ہے۔ مطبوعہ ہے اور آپ کی شرح بخاری "عمدة القاری" المعروف بہ "شرح العينى للبخاری" اور "شرح الكنز للعينى" بھی معروف ومطبوع ہے۔

٦٦- شرح الوقاية:

از صدرالشریعۃ ثانی عبيد الله بن مسعود المحبوبی الحنفی (متوفی ۷٤۷ھ) کی مشہور ومتداول کتاب ہے۔ انہوں نے "وقایہ" کا اختصار "نقایہ" کے نام سے کیا ہے۔

٦٧- الصحاح:

علم لغت میں اسماعیل بن حماد جوھری (متوفی ۳۹۳ھ) کی مشہور کتاب ہے۔ انہوں نے "اصلاح خلل الصحاح" کے نام سے بھی ایک کتاب لکھی ہے۔

٦٨- ظهيرية:

ظہیرالدین محمد بن احمد بن عمر البخاری متوفی (٦١٩ھ) کے تحریر کردہ فتاوی کا مجموعہ ہے۔
آپ ابوالمحاسن حسن بن علی المرغینانی کے اجل تلامذہ میں سے ہیں۔

٦٩- العباب الزاخر:

علم لغت میں لکھی گئی ضخیم تصنیف، جس کی ترتیب جوھری کی "صحاح" کے طرز پر ہے۔
بیس جلدوں میں لکھی گئی اس کتاب کے مصنف امام حسن بن محمد صاغانی متوفی ٦٥٠ھ ہیں۔

٧٠- عتابيه:

دیکھیے: فتاوی العتابی۔

٧١- عناية:

"هدايه" کی مشہور شرح، مصنف محمد بن محمود بابرتی متوفی ٧٨٦ھ ہیں۔ آسان اور نافع شرح ہے جو "فتح القدير" کے ہامش پر شائع ہوئی ہے۔ اور یہ شرح اس وجہ سے دوسری شروح سے ممتاز ہے کہ یہ صاحب "هدايه" کی دلیل کے "کبری" کو ذکر کرتے ہیں، جسے صاحب "هدايه" اکثر چھوڑ دیتے ہیں۔

٧٢- عيون المذاهب:

چاروں مذاہب کے فروعی مسائل کو جامع ہے۔ از علامہ محمد بن محمد بن احمد کاکی، متوفی ٧٤٩ھ۔

٧٣- غاية:

"هدايه" کی شروحات میں سے ایک، از علامہ ابوعباس احمد بن ابراھیم سروجی متوفی ٧١٠ھ یہ شرح مکمل نہ ہو سکی، "كتاب الإيمان" تک چھ ضخیم جلدوں میں لکھی گئی ہے۔

۷٤- غاية البيان و نادرة الأقران:

یہ بھی "هـدايـه" کی شرح ہے، مصنف ابوحنیفہ قوام الدین، امیر کاتب العمید بن امیر عمر اتقانی حنفی ہیں۔ ۷۵۸ھ میں فوت ہوئے۔ یہ کتاب چھبیس سال سات مہینے میں مکمل فرمائی۔ چھ جلدوں میں مخطوطہ ہے۔

۷۵- غرر الأذكار:

علامہ شمس الدین محمد بن محمد بخاری کی لکھی ہوئی ہے، جو محمد بن یوسف قونوی کی متن "درر البحار" کی شرح ہے۔

۷٦- فتاوی بزازية:

دیکھیے :بزازية

۷۷- فتاوی تتار خانية:

دیکھیے :تتار خانية

۷۸- فتاوی تمرتاشی:

علامہ ابومحمد ظہیر الدین احمد بن اسماعیل حنفی کی تالیف ہے۔آپ "خوارزم" کے مفتی تھے۔ ٦۰۰ھ میں فوت ہوئے۔

۷۹- فتاوی خيرية:

دیکھیے :خيرية

۸۰- فتاوی طرطوسية:

علامہ نجم الدین ابراہیم بن علی کی کتاب "انفع الوسائل" کا ایک نام ہے، دیکھیے :"انفع الوسائل".

۸۱- فتاوی ظهيرية:

دیکھیے :ظهيرية

۸۲- فتاوی العتابی:

عتابیہ کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے، احمد بن محمد عتابی متوفی ۵۸۶ھ کی تصنیف ہے۔

۸۳- فتاوی الفضلی:

از محمد بن فضل حنفی متوفی ۳۸۱ھ۔ مشہور حنفی فقیہ ہیں۔

۸۴- فتاوی قاری الهداية:

سراج الدین، عمر بن اسحٰق غزنوی ہندی المعروف بہ قاری الہدایۃ کے فتاوی کا مجموعہ ہے۔

۸۵- فتاوی قاضی خان:

دیکھیے: خانية

۸۶- فتح القدير:

کمال الدین محمد بن عبد الواحد سیواسی المعروف با بن الہمام متوفی ۶۸۱ھ کی شہرۂ آفاق کتاب جو انہوں نے ہدایہ کی شرح کے طور پر لکھی۔ کتاب الوکالۃ شروع کی تھی کہ وقت موعود آن پہنچا، پھر علامہ شمس الدین احمد بن قودر المعروف بہ "قاضی زادہ" ۹۸۸ھ نے مکمل کی۔

۸۷- الفوائد:

دو جلدوں میں "هداية" کی شرح ہے جو حمید الدین علی بن محمد الضریر متوفی ۶۶۷ھ نے لکھی۔

۸۸- فيض الغفار:

از محمد بن ابراھیم بن احمد، "جو امام" کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔ یہ دراصل عبداللہ بن محمود بن مودود کے متن "المختار" کی شرح ہے۔

۸۹- قِنيةُ المنية لتتميم الغُنية:

ابو الرجاء، نجم الدین، مختار بن محمود بن محمد زاہدی کی تصنیف ہے، جو آپ کے استاد علامہ

بدیع بن منصور عراقی کی "منیة الفقهاء" کی تہذیب ہے، اور مطبوعہ ہے۔ مصنف اصولاً معتزلی، فروعاً حنفی تھے۔ ۶۵۸ھ میں فوت ہوئے۔ "مجتبی" اور "حاوی" بھی انہی کی تصنیفات ہیں۔ دیکھیے: الحاوی نیز زاھدی.

۹۰- الکافی فی شرح الوافی:

یہ کنز الدقائق کے مصنف امام ابوابرکات عبداللہ احمد حافظ الدین النسفی رحمہ اللہ متوفی ۷۱۰ھ کی تصنیف ہے۔ مصنف نے اپنی تصنیف "الوافی" کی تلخیص بھی کی اور اس کا نام "کنز الدقائق" رکھا، اس کی شرح بھی کی اور اس کا نام "الکافی" رکھا۔

۹۱- الکافی فی فروع الحنفیة:

از علامہ محمد بن محمد بلخی کی تصنیف جو حاکم شہید کے لقب سے مشہور ہیں۔ اس کی شرح علامہ سرخسی نے لکھی جو "مبسوط سرخسی" کے نام سے مشہور ہے۔ مصنف کی یہ کتاب اور "منتقیٰ" نامی ایک دوسری کتاب فقہ حنفی کی معتمد ترین کتابیں ہیں۔ الکافی میں انہوں نے امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی چھ مشہور کتابوں کو جمع کیا ہے۔ آپ حدیث کے بھی بڑے حافظ تھے۔ ربیع الثانی ۳۳۴ھ میں بحالت سجدہ شہید کیے گئے۔ "مبسوط" کی تقریباً پندرہ جلدیں یعنی نصف کتاب اوزجند کی جیل میں املا کرائی گئی ہیں۔ کل اجزا اکتیس ہیں اور سولہ جلدوں میں مطبوعہ ہے۔

۹۲- کتاب الآثار:

از امام محمد بن حسن شیبانی رحمہ اللہ تعالیٰ، مسائل فقہ کے متعلق ایک ہزار احادیث پر مشتمل ہے۔ علامہ ابوالوفاء افغانی کی تعلیق کے ساتھ "إحیاء المعارف النعمانیة" نے شائع کیا ہے۔

۹۳- کتاب الأصل:

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی مایہ ناز تصنیف "مبسوط" کا لقب ہے۔ اس کے متعدد نسخے ہیں

جن میں سے ابوسلیمان جوزجانی کا نسخہ مشہور ہے۔ مبسوط کی بہت سے متأخرین نے شرحیں لکھی ہیں مثلاً شیخ الاسلام بکر المعروف بخواہرزادہ (جن کی شرح بڑی مبسوط کہلاتی ہے) اور شمس الائمہ حلوانی وغیرہ کی مبسوطات۔ ان کی مبسوطات دراصل "مبسوط" کی شروح ہیں اور "جامع صغیر" کی شروحات کے طرز پر متن اور شرح میں امتیاز نہیں ہے۔

۹۴- کتاب الخراج:

امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کی تصنیف ہے، جو انہوں نے ہارون الرشید کی فرمائش پر لکھی۔ اس میں حکومت اسلامیہ کے مالی نظام سے بحث کی گئی ہے۔ مقدمہ کتاب سے واضح ہوتا ہے کہ امام اظہار حق میں نہ حکمرانوں کا لحاظ کرتے تھے نہ عوام کا، آپ کے بعد اس موضوع پر جس نے بھی کوئی کتاب لکھی اس سے استفادہ کئے بغیر چارہ نہ پایا۔ کتب اسلامیہ میں عدیم النظیر اور بے مثال تصنیف ہے۔

۹۵- کفایة:

"ھدایہ" کی مختصر لیکن نادر علمی نکات سے بھرپور شرح، جسے جلال الدین بن شمس الدین کرمانی خوارزمی متوفی ۷۹۰ھ نے تصنیف کیا۔

۹۶- کنز الدقائق:

فقہ حنفی کے چار معتبر ترین متون میں سے ایک...... امام ابوالبرکات، حافظ الدین امام عبداللہ بن احمد نسفی متوفی ۷۱۰ھ کی تالیف۔ اس میں انہوں نے اپنی کتاب "الوافی" کی شرح کی تلخیص کی ہے۔

۹۷- مبتغی:

حنفیہ کے فروعی مسائل میں ہے۔ شیخ عیسیٰ بن محمد قرشہری کی تصنیف، جو انہوں نے ۷۳۴ھ میں مکمل کی۔

۹۸- مبسوط:

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی کتب ستہ میں سے ایک، متأخرین حنفیہ نے اس کی بہت سی شروح لکھیں، مثلاً شیخ الاسلام بکر المعروف بخواہرزادہ نے، آپ کی شرح ''بڑی مبسوط'' کہلاتی ہے۔ اس کے علاوہ شمس الأئمہ حلوانی اور دیگر حضرات نے، ان سب حضرات نے شرح کی عبارت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی ''مبسوط'' کی عبارت سے ملا کر لکھی ہے، اس لیے ان کی شروح کو بھی ''مبسوط'' کہا جاتا ہے، ورنہ یہ مستقل مبسوطیں نہیں، امام محمد کی ''مبسوط'' کی شرحیں ہیں۔

۹۹- مجتبیٰ:

شرح قدوری از علامہ نجم الدین مختار بن محمود زاہدی متوفی ۶۵۸ھ۔ مزید دیکھیے: زاھدی

۱۰۰- مجمع البحرین:

علامہ احمد بن علی بن ثعلب بغدادی المعروف بابن الساعاتی متوفی ۶۹۴ھ کا مشہور متن، اس میں ''قدوری'' اور ''منظومۃ الخلافیات'' کے مسائل کو جمع کیا گیا ہے، اس لئے ''مجمع البحرین'' نام رکھا ہے۔ پورا نام ''مجمع البحرین وملتقی النهرین'' ہے۔ اس کی شرح خود مصنف نے دو جلدوں میں لکھی ہے۔ ایک اور شرح علامہ شمس الدین محمد بن یوسف قونوی نے اور ایک علامہ عبد اللطیف بن عبد العزیز نے لکھی ہے، جو ابن ملک کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ شرح سب سے زیادہ مشہور ہے۔ ''منظومۃ الخلافیات'' عقائد نسفیہ کے مصنف مفتی الثقلین علامہ نجم الدین ابو حفص عمر بن محمد نسفی متوفی ۵۳۷ھ کی کتاب ہے۔ اس منظومہ کی مبسوط شرح مصنف ''کنز الدقائق'' نے ''المستصفی'' کے نام سے لکھی ہے۔ پھر اس کا اختصار ''المصفی'' کے نام سے کیا ہے۔ ''مجمع البحرین'' میں چونکہ ''قدوری'' کے سب مسائل آ گئے ہیں اس لئے متاخرین احناف فقہ حنفی کے متون اربعہ میں بجائے ''قدوری'' کے ''مجمع'' کو شامل کرتے ہیں۔

۱۰۱- مجمع الفتاوی:

از احمد بن محمد بن ابی بکر حنفی

۱۰۲- محیط:

یہ نام جب مطلقاً لیا جائے تو اس سے "محیط برھانی" مراد ہوتی ہے، بعض نے "محیط رضوی" کے متعلق یہی کہا ہے، لیکن پہلا قول صحیح ہے۔ اس کا پورا نام "المحیط البرھانی فی الفقہ النعمانی" ہے۔ مصنف کا نام برہان الدین محمود بن تاج الدین احمد بن صدر الدین برہان الائمۃ عمر بن مازہ بخاری متوفی ٦١٦ھ ہے۔

آپ نے اس کی تلخیص بھی کی ہے، جو "الذخیرۃ البرھانیۃ" سے معروف ہے "ذخیرۃ الفتاوی" بھی کہا جاتا ہے۔ حنفیہ کی ایک اور محیط بھی ہے، جس کو "المحیط الرضوی" کہتے ہیں، یہ علامہ رضی الدین محمد بن محمد سرخسی متوفی ۵۷۱ھ کی تالیف ہے۔ اس کو "المحیط السرخسی" بھی کہتے ہیں۔ محیط کا معنی ہے احاطہ کرنے والی۔ چونکہ یہ مسائل مذہب کے تینوں طبقات اصول، نوادر، نوازل کا احاطہ کرتی ہے اس لئے مصنف نے اس کا نام "محیط" رکھا ہے۔ محیط برہانی کو "المحیط الکبیر" کہتے ہیں۔ یہ عرصہ دراز تک مخطوطہ تھی۔ اب ادارۃ القرآن کراچی نے اہتمام کے ساتھ شائع کردی ہے۔

۱۰۳- المختار:

اختیار کا متن ہے۔ دیکھیے: الاختیار

۱۰٤- مختارات النوازل:

صاحب "ھدایہ" امام علی بن ابی بکر فرغانی متوفی ۵۹۳ھ کی تالیف ہے۔ اس میں مسائل کی نوع ثالث "نوازل" میں سے چیدہ چیدہ مسائل کو جمع کیا گیا ہے۔

۱۰۵- المستصفی:

"منظومۃ النسفی" کی شرح ہے۔ منظومہ، صاحب "عقائد نسفیۃ" مفتی الثقلین، نجم الدین، ابو حفص عمر بن محمد نسفی متوفی ۵۳۷ھ کی تالیف ہے۔ اس کی مبسوط شرح

مصنفِ "کنز" حافظ الدین، عبداللہ بن احمد نسفی نے "المستصفی" کے نام سے لکھی، پھر اس کی تلخیص "المصفی" کے نام سے کی۔

١٠٦- المصباح المنیر فی غریب الشرح الکبیر:

از امام احمد بن محمد فیوی متوفی ٧٧٠ھ۔ فقہی "معجم" ہے، جس میں علامہ رافعی کی "الوجیز" کی شرح کے غریب الفاظ کی تشریح بمع اضافات کی گئی ہے۔

١٠٧- معراج الدرایة إلی شرح الهدایة:

"هدایه" کی مشہور شروح میں سے ایک، علامہ محمد کاکی متوفی ٧٤٩ھ کی تالیف ہے۔

١٠٨- المُغرب:

فقہی الفاظ واصطلاحات کی جامع لغت، از ناصر الدین بن عبد السید مطرزی متوفی ٦١٠ھ۔ مقبول ومتداول کتاب ہے۔

مقدمة أبی اللیث:

از امام ابو اللیث نصر بن محمد سمرقندی متوفی ٣٨٣ھ۔ ان کی دو اور کتابیں بھی مشہور ہیں: "خزانة الفقه"، "عیون المسائل".

١٠٩- الملتقط فی الفتاوی:

از ناصر الدین، ابو القاسم محمد بن یوسف حسینی سمرقندی متوفی ٥٥٦ھ۔

١١٠- ملتقی الأبحر:

"غنیة المتملی المعروف بکبیری" کے مصنف ابراہیم بن محمد حلبی متوفی ٩٥٦ھ کا تحریر کردہ متن ہے۔ اس میں فقہ حنفی کے چار معتبر ومشہور متون قدوری، کنز، مختار اور وقایہ کے مسائل کو جمع کیا گیا ہے۔ نیز "هدایه" اور "مجمع البحرین" سے ضروری مسائل کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس کی دو شرحیں مشہور ہیں، ایک شیخ زادہ عبد الرحمٰن بن محمد سلیمان متوفی ١٠٧٨ھ کی جو داماد آفندی کے لقب سے مشہور ہیں۔ اس کا نام "مجمع الأنهر" ہے اور یہ مطبوعہ ہے۔ دوسری

"در مختار" کے مصنف علامہ علاء الدین حصکفی متوفی ۱۰۸۸ھ کی، اس کا نام "سکب الأنہر" ہے دوسرا نام "الدر المنتقی فی شرح الملتقی" ہے۔ اسی نام سے مشہور ہے۔ یہ "مجمع الأنہر شرح ملتقی الأبحر" کے حاشیے پر شائع ہوئی ہے۔

۱۱۱- المنتقی:

صاحب "ھدایہ" امام علی بن ابی بکر فرغانی متوفی ۵۹۳ھ کی تصنیف۔ آپ ائمہ فقہاء میں سے تھے۔ علم فقہ میں آپ کی چند نافع اور مقبول کتب یہ ہیں: "ھدایہ"، "تجنیس" اور "مزید".

۱۱۲- منتقی الأنہر فی شرح ملتقی الابحر:

از محمد بن احمد صدیق حنفی۔

۱۱۳- منح الغفار:

"در مختار" کے متن "تنویر الابصار" کی شرح ہے جو خود ماتن نے لکھی۔ اسم گرامی محمد بن عبداللہ تمر تاشی غزی (متوفی ۱۰۰۴ھ) ہے۔ غیر مطبوعہ ہے۔ در مختار یا شامیہ میں جب "قال المصنف فی المنح" آئے تو اس سے یہی منح الغفار مراد ہوتی ہے۔

۱۱۴- منیة:

پورا نام "منیة المصلی" ہے، مسائل نماز کی مستند کتاب ہے۔ مصنف علامہ سدید الدین کاشغری ہیں۔ اس کی متعدد شروح لکھی گئیں۔ درج ذیل دو زیادہ مشہور ہیں، دونوں حلب کے رہنے والے دو مشہور عالموں کی تصنیف ہیں۔

۱۱۵- غنیة المتملی شرح منیة المصلی:

یہ "کبیری" کے نام سے مشہور ہے، فروع صلوۃ میں حنفیہ کے نزدیک سند مانی جاتی ہے۔ دسویں صدی کے مشہور حنفی فقیہ اور مصنف علامہ ابراہیم بن محمد حلبی متوفی ۹۵۶ھ کی تالیف ہے۔ مصنف نے اسی متن کی ایک اور مختصر شرح "صغیری شرح منیہ" بھی لکھی ہے۔ متأخرین حنفیہ میں مشہور متن "ملتقی الأبحر" جو متون اربعہ معتمدہ کا نچوڑ ہے انہی کے زور قلم کا شاہکار ہے۔

۱۱۶- حلية المُجلّي شرح منية المُصلّي:

ابوعبداللہ شمس الدین محمد بن محمد حلبی المعروف بابن امیر حاج متوفی ۸۷۹ھ کی تالیف ہے جو علامہ ابن الہمام کے شاگرد رشید تھے۔ حلیہ کے معنی زیور، مجلّی دوڑ میں آگے رہنے والا گھوڑا۔ مصلّی: دوسرے نمبر پر آنے والا گھوڑا۔

۱۱۷- مواهب الرحمان في مذهب النعمان:

از ابراہیم بن موسی طرابلسی متوفی ۹۲۲ھ۔ دو جلدوں میں ہے۔

۱۱۸- النافع في الفروع:

امام ابواللیث نصر بن محمد سمرقندی متوفی ۳۹۳ھ کی تصنیف ہے۔

۱۱۹- النُّتَف في الفتاوى:

کتاب کا پورا نام "النُّتَف الحسان" ہے۔ نُتَف، نُتَفة کی جمع ہے جس کا معنی ہے تھوڑا سا، یقال: أعطاه نتفة من الطعام أو أفاده نتفة من العلم أي قليلاً. حسان، حسنۃ کی جمع ہے بمعنی بہترین...... پس النتف الحسان کا معنی ہوا: "شاندار باتوں کا مختصر سا مجموعہ" یہ کتاب دو جلدوں میں ہے۔ اس میں فتاوی کا انتخاب کیا گیا ہے۔ مصنف کا نام شیخ الاسلام ابو الحسن علی بن حسین سغدی متوفی ٤٦١ھ ہے۔ آپ شمس الائمہ سرخسی کے شاگرد ہیں، ان سے "سیر کبیر" روایت کی ہے، "جامع کبیر" کی شرح بھی آپ نے لکھی ہے۔ "فتاوی خانیہ" اور "بزازیہ" میں کثرت سے آپ کا تذکرہ آتا ہے۔ اس کتاب کا مخطوطہ ترکی کے "توپ کاپی" میوزیم میں محفوظ ہے۔

۱۲۰- النقاية:

بمعنی عمدہ خلاصہ، از صدر الشریعۃ الاصغر عبید اللہ بن مسعود متوفی ۷٤۷ھ۔ یہ کتاب فقہ حنفی کے مشہور متن وقایہ کا اختصار ہے۔ اس کی تین شرحیں مشہور ہیں۔ علامہ شامی تینوں سے استفادہ

کرتے ہیں: (۱) قہستانی کی شرح بنام "جامع الرموز". (۲) ملا علی قاری کی شرح جو "شرح نقایہ" کے نام سے طبع ہوئی ہے۔ (۳) علامہ شمنی کی شرح۔ دیکھیے :قهستاني و شمني.

۱۲۱- النهاية في شرح الهداية:

"هداية" کی اولین شرح، مصنف حسین بن علی سغناقی متوفی ۷۱۱ھ ہیں۔ جو فقہ، نحو اور مناظرہ میں امام مانے جاتے تھے۔

۱۲۲- النهر الفائق شرح كنز الدقائق:

"البحر الرائق" کے مصنف کے چھوٹے بھائی سراج الدین عمر بن ابراھیم بن نجیم متوفی ۱۰۰۵ھ کی تالیف ہے۔ یہ شرح اب تک طبع نہیں ہوئی۔ کتاب القضاء فصل في الحبس تک ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں اپنے بھائی کی شرح کنز "البحر الرائق" پر مناقشات بھی ذکر کیے ہیں۔

۱۲۳- النوادر:

از امام محمد بن شجاع ثلجی متوفی ۲۶۶ھ۔ "التجريد" اور "تصحيح الآثار" بھی آپ کی تالیفات میں سے ہیں۔

۱۲۴- الهداية في الفروع شرح بداية المبتدی:

متأخرین احناف کی مشہور ترین کتاب، جس کی بے شمار شرحیں لکھی گئی ہیں۔ مصنف کا نام نامی ابو الحسن علی بن ابی بکر فرغانی ہے۔ ۵۹۳ھ میں فوت ہوئے۔

۱۲۵- الوافي:

از امام ابو البرکات، حافظ الدین، عبد اللہ بن احمد نسفی متوفی ۷۱۰ھ۔

۱۲۶- الواقعات:

از صدر شہید، حسام الدین، برھان الدین الکبیر، عمر بن عبد العزیز بن مازہ متوفی ۵۳۶ھ،

چھٹی صدی ہجری کے اکابر احناف میں سے ہیں۔ان کی اس کتاب کو"واقعات حسامية" بھی کہتے ہیں۔اس میں انہوں نے فقیہ ابواللیث کی کتاب "النوازل" اور ناطفی کی "واقعات" کو جمع کیا ہے۔نیز امام ابوبکر محمد بن فضل اور مفتیان سمرقند کے فتاوی کو بھی اس میں لیا گیا ہے۔مخطوطہ ہے۔

۱۲۷- الوقاية:

از برھان الشریعۃ، محمود بن عبید اللہ محبوبی جو ساتویں صدی کے مشہور حنفی عالم ہیں۔یہ کتاب فقہ حنفی کے متون اربعہ میں سے ہے۔

۱۲۸- الولوالجية:

"فتاوی ولوالجية" دو جلدوں میں ابوالفتح ظہیر الدین، عبدالرشید بن ابی حنیفہ ولوالجی متوفی ٥٤٠ھ کی تالیف ہے۔"ولوالج" افغانستان کے صوبہ بدخشان کا ایک قصبہ ہے۔اس کا نسخہ قونیہ ترکی میں ہے۔

۱۲۹- وهبانية:

علامہ عبدالوھاب بن احمد بن وھبان دمشقی متوفی ۷٦۸ھ کا منظومہ ہے۔یہ قصیدہ رائیۃ ہے۔پورا نام "قيد الشرائد ونظم الفرائد" ہے۔خود مصنف نے اس کی شرح دو جلدوں میں "عقد القلائد في حل قيد الشرائد" کے نام سے لکھی پھر علامہ عبدالبر بن محمد المعروف بابن الشحنۃ متوفی ۹۲۱ھ نے اس شرح کی تہذیب و اضافہ کا کام "تفصيل عقد الفرائد بتكميل قيد الشرائد" کے نام سے کیا۔یہ شرح بھی منظوم ہے۔درمختار میں ہر باب کے آخر میں اس منظومہ اور اس کی شرح سے بکثرت اشعار لئے جاتے ہیں۔اس کی ایک شرح صاحب نور الایضاح علامہ شرنبلالی نے بھی لکھی ہے۔اس کا حوالہ بھی الختار اور شامیہ میں بکثرت آتا ہے۔

۱۳۰- الينابيع في معرفة الأصول والتفاريع:

یہ "قدوری" کی شرح ہے۔از محمد بن عبداللہ شبلی متوفی ۷٦۹ھ۔اسے محمود بن رمضان رومی کی طرف بھی منسوب کرتے ہیں، جنہوں نے اس کی تبییض اور تتمیم فوائد کا کام کیا۔

شخصیات رد المحتار

ان سو سے زائد مشہور شخصیات کا مختصر تعارف جن کا تذکرہ "ردالمحتار" میں بکثرت آیا ہے۔

۱ - ابن امیر حاج:

شمس الدین محمد بن محمد حلبی متوفی ۸۷۹ھ المعروف بابن امیر حاج۔ اپنے استاد علامہ ابن الہمام کی طرح محقق عالم تھے "حلية المُجلّي شرح مُنية المصلِّي" انہی کی تصنیف ہے۔

محقق ابن الہمام کی "التحرير بين اصول الشافعية و الحنفية" کی شرح بنام "التقرير و التحبير" تین جلدوں میں انہوں نے لکھی ہے۔

۲ - ابن حجر مکی:

شہاب الدین، احمد بن محمد بن علی، المعروف بابن حجر ہیثمی مکی متوفی ۹۷۴ھ۔ جلیل القدر شافعی فقیہ ہیں۔ ولادت مصر میں "الهيثم" نامی محلے میں ہوئی اس لئے "هيثمی" کہلاتے ہیں۔ وفات مکہ مکرمہ میں ہوئی اس لئے مکی بھی کہلاتے ہیں۔ آپ کا "فتاوی کبری" جو "فتاوی هيثمی" کے نام سے بھی مشہور ہے چار جلدوں میں مطبوعہ ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ کی وفات کے پچاس برس بعد پیدا ہوئے۔ ان کی طرح آپ سے بھی امت کو بہت فیض پہنچا۔

٣- ابن الساعاتی:

مظفر الدین احمد بن علی بغدادی متوفی ٦٩٤ھ "مجمع البحرین" انہی کا مشہور متن ہے، جس میں قدوری اور منظومہ نسفی کے مسائل کو جمع کیا گیا ہے۔ اصول فقہ میں آپ کا لکھا ہوا متن "بديع النظام الجامع بين كتابي البزدوي والإحكام للآمدي" ہے، جس کی شرح علامہ سراج الدین ابو حفص عمر بن اسحاق ہندی مصری حنفی متوفی ٧٧٣ھ نے لکھی ہے۔ اس کا نام "كاشف معاني البديع وبيان مشكلة المنيع" ہے، متن اور شرح دونوں مخطوطہ ہیں۔

٤- ابن سماعة:

ابو عبد اللہ محمد بن سماعہ تمیمی متوفی ٢٣٣ھ۔ صاحبین اور حسن بن زیاد کے شاگرد اور امام طحاوی کے استاذ ابو جعفر احمد بن ابی عمران کے استاذ ہیں۔ متعدد کتابیں تصنیف کیں جن میں "كتاب النوادر" اور "أدب القاضي" مشہور ہیں۔ اول الذکر میں صاحبین سے سماع کردہ مسائل جمع کئے ہیں۔ آپ کی صحت وتندرستی کا یہ عالم تھا کہ ایک سو چار سال کی عمر میں گھوڑے پر سواری کرتے، کنواری لڑکی سے شادی کرتے اور روزانہ دو سو رکعت نفلیں پڑھتے تھے۔ ان کے انتقال پر محدث کبیر یحی بن معین نے فرمایا: "مات ريحانة العلم من أهل الرأي". (فقہاء میں سے علم کا گلدستہ اٹھ گیا)۔

٥- ابن شجاع:

ابو عبد اللہ ثلجی متوفی ٢٦٦ھ۔ حسن بن زیاد لؤلؤی کے شاگرد ہیں۔ کئی کتابیں تصنیف کیں۔ "تصحيح الآثار والنوادر"، "تجريد" اور "النوادر في الفروع" مشہور ہیں۔

٦- ابن الشحنة:

عبد البر بن محمد حلبی المعروف بابن الشحنۃ متوفی ٩٢١ھ۔ حافظ ابن حجر عسقلانی اور محقق ابن الہمام کے شاگرد ہیں اور منظومہ "وهبانية" کی شرح لکھی ہے، جو شیخ عبد الوہاب بن احمد بن

وھبان کا فقہی منظومہ ہے۔اس قصیدہ کا نام "قید الشرائد و نظم الفرائد " ہے۔ناظم نے خود اس کی شرح "عقد القلائد فی حل قید الشرائد" کے نام سے لکھی۔ابن الشحنۃ نے اس کی تہذیب واضافہ بنام "تفصیل عقد الفرائد بتکمیل قید الشرائد "کیا۔ابن الشحنہ (داروغہ زادہ) خاندانی لقب ہے۔آپ کے دادا ابن الشحنہ کبیر نے "ہدایہ" کی شرح لکھی ہے۔

٧- ابن کمال پاشا:

قاضی شمس الدین احمد بن سلیمان بن کمال پاشا متوفی ٩٤٠ھ۔دسویں صدی ہجری کے مشہور محقق اور مصنف ہیں۔آپ نے اتنی کثیر تعداد میں تصانیف تحریر کی ہیں کہ آپ کے بارے میں کہا جاتا ہے:"قلما یوجد فن من الفنون ولیس لابن کمال باشا مصنف فیه". بعض کے نام یہ ہیں:"طبقات الفقهاء"، "طبقات المحتهدین"، "الإصلاح والإیضاح". (متن وشرح ہیں)"تغییر التنقیح" (اصول فقہ کا متن ہے)،"هدایه" کا حاشیہ۔اس کے علاوہ مختلف موضوعات پر تقریباً ٣٦ رسائل۔آپ ابن کمال اور ابن الکمال سے مشہور ہیں۔

٨- ابن نجیم:

زین الدین بن ابراھیم مصری متوفی ٩٧٠ھ۔ان کی تصانیف میں سے "الأشباه والنظائر" کی متعدد شروح لکھی گئی ہیں۔علامہ رملی نے اس کا مشہور حاشیہ بنام "نزهة النواظر" لکھا ہے۔اس کی معروف شرحیں تین ہیں جو درج ذیل ہیں:

(١) تاج الدین محمد ھبۃ اللہ بن محمد بعلی کی "التحقیق الباهر شرح الاشباه والنظائر"

(٢) ابوالعباس احمد بن محمد حموی کی احمد بن محمد حموی کی "غمز عیون البصائر فی شرح الاشباه والنظائر"

(٣) "عمدة ذوی البصائر لحل مهمات الاشباه والنظائر" یہ شیخ ابراہیم بن حسین بِرّی کی تحریر کردہ ہے".

"البحر الرائق" کتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة تک آپ کے قلم سے ہے۔ یہ باب مکمل نہیں ہوا تھا کہ وقت موعود آ پہنچا۔ آپ کی وفات کے بعد اس شرح کا تکملہ شیخ محمد بن حسین طوری قادری (متوفی ۱۱۳۸ھ کے بعد) نے لکھا ہے۔ آٹھویں جلد تکملہ ہے۔ اس کے علاوہ "فتاویٰ زینیه" اور "مجموعه رسائل زینیه" (اکتالیس رسالوں کا مجموعہ ہے) ان کی مشہور تصانیف ہیں۔

۹- ابن نجیم:

عمر بن ابراھیم، صاحب بحر کے بھائی ہیں۔ "النهر الفائق شرح کنز الدقائق" انہی کی تصنیف ہے۔ ۱۰۰۵ھ میں فوت ہوئے۔

۱۰- ابن الہمام:

دیکھیے: کمال

۱۱- ابو جعفر:

محمد بن عبد اللہ الہندوانی، متوفی ۳۶۲ھ۔ فقیہ ابو جعفر ہندوانی کے لقب سے مشہور ہیں۔ ان کو فقہ میں کامل دسترس کی بنا پر "أبو حنيفه الصغير" کہا جاتا تھا۔ چار واسطوں سے امام محمد کے شاگرد ہیں اور فقیہ ابو اللیث سمرقندی کے استاذ ہیں۔ وفات بخارا میں ہوئی ہے۔ ہندوان شہر بلخ کا ایک محلّہ تھا جہاں ہندوستان سے درآمد کردہ سامان اتارا جاتا تھا، اس محلّہ کی طرف نسبت ہے۔ مولانا لکھنوی نے آپ کے متعلق لکھا ہے: "شيخ كبير وإمام جليل القدر من أهل بلخ، كان على جانب عظيم من الفقه والذكاء والزهد والورع ......حدّث ببلخ، وأفتى بالمشكلات وأوضح المعضلات".

۱۲- ابو حفص البخاری:

احمد بن حفص الکبیر حنفیہ کے کبار مشائخ میں سے ہیں۔ امام محمد کے شاگرد اور ان کی کتابوں کے راوی ہیں۔ کتاب الاصل کی اب دو ہی روایتیں باقی ہیں، ایک آپ کی اور دوسری ابو

سلیمان جوز جانی کی۔اصحاب ترجیح کے مرتبے میں گردانے جاتے ہیں۔ابوحفص الکبیر کے لقب سے مشہور ہیں۔ان کے بیٹے ابوحفص الصغیر سے پکارے جاتے ہیں۔

۱۳- ابوزید دبوسی:

عبیداللہ بن عمر متوفی ٤٣٠ھ۔ائمہ فقہاء میں سے ہیں۔ان کو"علم الخلاف" کا واضع مانا جاتا ہے۔"الأسرار" ان کی مایہ ناز تصنیف ہے۔"الإمداد الأقصی "بھی انہوں نے تحریر کی ہے۔

١٤- ابوسعید البردعی:

قاضی احمد بن حسین متوفی ۳۱۷ھ۔اپنے زمانے میں حنفیہ کی ریاست ان پر ختم تھی۔ قرامطہ کے فتنے میں حاجیوں کے ساتھ شہید کئے گئے۔

۱۵- ابوعلی نسفی:

قاضی حسین بن خضر متوفی ٤٢٤ھ۔"فوائد وفتاوی" کے مصنف ہیں۔

١٦- ابوالليث سمرقندی:

امام المهدی نصر بن محمد المعروف بہ فقیہ ابواللیث سمرقندی متوفی ۳۷۳ھ۔احناف کے مشہور اور ممتاز فقہا سے ہیں۔چوتھی صدی ہجری ان کا زمانہ ہے"كتاب النوازل" اور تنبيه الغافلين، بستان العارفين، مقدمة ابی الليث، خزانه الفقه، عيون المسائل وغیرہ آپ کی تصنیفات ہیں۔چند غیر مطبوعہ کتابیں یہ ہیں:شرح جامع صغير، مبسوط، مختلف الراوية، شرعية الإسلام، أصول الدين، عمدة العقائد.

۱۷- ابوالمعالی:

محمد بن نصر عامری متوفی ۵۵۵ھ۔صدر الاسلام بزدوی اور ان کے بھائی فخر الاسلام بزدوی کے شاگرد ہیں۔

۱۸- ابونصر الاقطع:

احمد بن محمد، امام "قدوری" کے شاگرد ہیں۔ "مختصر قدوری" کی شرح لکھی ہے۔ تتار کے حملے میں آپ کے ہاتھ کاٹ دیئے گئے تھے۔ ۴۷۴ھ میں فوت ہوئے۔

۱۹- ابویوسف:

یعقوب بن ابراھیم انصاری، کوفی، بغدادی متوفی ۱۸۲ھ۔ امام صاحب کے سب سے بڑے شاگرد اور امام محمد کے استاد ہیں۔ قال یحی بن معین: "لیس فی أصحاب الرأی أکثر حدیثاً ولا أثبت من أبی یوسف". عباسی خلفاء مہدی، ہادی اور ہارون رشید کے زمانے میں قاضی رہے۔ قاضی القضاۃ کا لقب سب سے پہلے آپ کو دیا گیا۔ تصنیفات یہ ہیں: "کتاب الخراج"، "کتاب الآثار"، "کتاب الرد علی سیر الأوزاعی"، "أمالی" اور "اختلاف أبی حنیفة وابن أبی لیلی".

۲۰- اخی زادہ:

عبدالحلیم بن محمد رومی متوفی ۱۰۱۳ھ۔ "الأشباہ والنظائر" پر تعلیق لکھی ہے۔ "جامع الفصولین" اور "الدرر والغرر" پر حاشیہ بھی لکھا ہے۔ نیز "ھدایہ" کی ایک شرح بھی لکھی ہے۔

۲۱- الاسبیجابی:

شیخ الاسلام علی بن محمد متوفی ۵۳۵ھ۔ جب قاضی کا لفظ علی الاطلاق بولا جائے تو یہی مراد ہوتے ہیں۔ "مختصر طحاوی" کے شارح ہیں۔

۲۲- الإسبیجابی:

ابوالمعالی محمد بن احمد۔ "زاد الفقھاء" کے نام سے "قدوری" کی شرح لکھی ہے۔ چھٹی صدی ھجری کے آخر میں فوت ہوئے۔

۲۳- اسد بن عمرو:

القاضی البجلی، امام ابوحنیفہ کے شاگرد اور حنفیہ کے دس متقدمین فی المذہب میں سے ہیں۔ ۱۸۸ھ یا ۱۸۹ھ میں انتقال فرمایا۔

۲٤- اکمل:

اکمل الدین، محمد بن محمد، رومی بابرتی متوفی ۷۸٦ھ۔ سید شریف جرجانی کے استاد ہیں۔ کتب فقہ میں اکمل اور الاکمل سے آپ ہی مراد ہوتے ہیں۔ آپ کی مشہور کتاب "هدایه" کی شرح "عنایه" ہے جو "هدایه" کے حل کیلئے بہترین ہے۔ اس کے علاوہ "شرح مشارق الأنوار"، "التقریر علی أصول البزدوی" اور منار کی شرح "شرح وصیة الإمام أبی حنیفة"، "الإرشاد فی شرح الفقه الأکبر" "خلاطی" کی تلخیص "الجامع الکبیر" کی شرح وغیرہ بھی آپ نے لکھی ہے۔ وفات قاہرہ میں ۷۸٦ھ میں ہوئی۔

۲۵- اوزجندی:

شمس الأئمہ محمد بن عبد القادر، قاضی خان کے دادا ہیں۔ امام سرخسی کے شاگرد ہیں۔ اوزجندی مشہور حنفی فقیہ محمود بن عبد العزیز کی نسبت بھی ہے۔

۲٦- برکوی:

محی الدین، محمود بن پیر علی برکوی رومی متوفی ۹۸۱ھ۔ مشہور نحوی، صرفی، فقیہ اور محدث ہیں۔ آپ کی فقہی تصنیفات یہ ہیں: "شرح وقایه کا حاشیه"، "ذخیرة المتأهلین"، "النساء فی تعریف الأطهار والدماء" اور "رسالة فی حرمة التغنی". علامہ شامی نے "باب الحیض" میں آپ کے رسالے سے بکثرت نقل کیا ہے۔

۲۷- برهان الدین:

محمود بن تاج الدین الصدر الشهید، برهان الائمۃ محیط برھانی کے مصنف جو "المحیط الکبیر" کہلاتی ہے۔"الذخیرة البرهانية" کے نام سے آپ نے اس کی تلخیص بھی کی جو "ذخيرة الفتاوی" سے معروف ہے۔۶۱۶ھ میں وفات پائی۔

۲۸- بزازی:

"فتاوی بزازيه مسماة بو جيز" کے مصنف محمد بن محمد کردری متوفی ۸۲۷ھ۔ "مناقب کردری" جس کا اصل نام "مناقب الإمام اعظم" ہے، بھی آپ کی تصنیف ہے۔

۲۹- بزدوی:

دیکھیے: صدرالاسلام بزدوی۔

۳۰- بعلی:

تاج الدین محمد ہبۃ اللہ بن محمد بعلی دمشقی متوفی ۲۲۴ھ۔"التحقيق الباهر" کے نام سے "الأشباه و النظائر" کی شرح لکھی ہے۔

۳۱- بقالی:

زین المشائخ محمد بن ابو القاسم متوفی ۵۸۶ھ یا ۵۶۲ھ۔آپ کی کئی تصانیف ہیں جن میں سے "جمع التفاريق" معروف ہے۔

۳۲- بلخی:

قاضی ابو مطیع، حکم بن عبد اللہ، متوفی ۱۹۹ھ۔امام صاحب سے "الفقه الأكبر" کی روایت کی ہے۔قیاس کے بڑے عالم تھے۔

۳۳- بیری:

ابراھیم بن حسین حنفی، متوفی ۱۰۹۹ھ۔ مکہ مکرمہ کے مفتی تھے۔ "عمدة ذوی البصائر لحلّ مهمات الأشباه و النظائر" کے نام سے ابن نجیم کی "أشباه" کی شرح لکھی ہے۔ علامہ شامی نے "رسم المفتی" میں اس شرح سے بکثرت استفادہ کیا ہے۔

۳۴- جمال الدین:

ابوسعد المطہر بن حسن یزدی متوفی ۵۹۱ھ۔ "مختصر القدوری" کی مشہور شرح "اللباب فی شرح الكتاب" انہی کی تصنیف ہے۔

۳۵- حارثی:

محمود بن عبید اللہ متوفی ۶۰۶ھ، "العون فی الفقه" کے مصنف ہیں۔

۳۶- حدادی:

ابوبکر بن علی یمنی حدادی سے مشہور ہیں۔ "قدوری" کی شرح تین جلدوں میں بنام "السراج الوهاج الموضح لكل طالب و محتاج" لکھی، پھر "الجوهرة النيرة" کے نام سے اس کی تلخیص کی۔ ۸۰۰ھ کے آس پاس فوت ہوئے۔ آپ کا تعلق یمن کے علاقہ "عبادیه" سے تھا، وفات یمن کے مشہور قصبہ "زبید" میں ہوئی ہے۔ علامہ حدادی اور علامہ الحداد سے آپ مشہور ہیں۔ آپ کے سوانح نگاروں نے آپ کے متعلق لکھا ہے:

"له فی مذهب أبی حنيفة مصنفات جليلة، لم يصنف أحد من العلماء الحنفية باليمن كثرةً و إفادة".

۳۷- حسام الدین رازی:

علی بن احمد، "خلاصة الدلائل فی تنقيح المسائل" کے نام سے "قدوری" کی شرح لکھی ہے۔ سن وفات ۵۹۸ھ۔

۳۸- حلبی:

ابراھیم بن محمد حلبی متوفی ۹۵٦ھ۔ دسویں صدی کے مشہور اور کثیر التصانیف حنفی فقیہ ہیں۔ "ملتقی الأبحر" آپ کا لکھا ہوا مشہور متن ہے۔ اس کے علاوہ "غنیة المتملّی فی شرح منیة المصلی" (کبیری سے مشہور ہے) "صغیری شرح منیه" آپ کی یادگار تصانیف ہیں۔ آپ نے "قاموس"، "فتاوی تاتار خانیه" اور "الجواهر المضیئة فی طبقات الحنفیة" کی تلخیص بھی کی ہے۔ (اس کے علاوہ دیکھیے: ابن امیر حاج حلبی)

۳۹- حلوانی:

شمس الائمہ عبد العزیز بن احمد بخاری متوفی ٤٤٨ھ۔ پانچویں صدی ہجری کے مشہور حنفی فقیہ ہیں۔ شمس الائمہ محمد بن احمد سرخسی کے استاد ہیں۔ "مبسوط"، "فتاوی" کے علاوہ امام ابو یوسف کی "أدب القاضی" کی شرح تصنیف کی۔ آپ کو حلوانی اور حلوائی (نون کی بجائے ہمزہ، منسوب بحلویٰ بمعنی مٹھائی) دونوں طرح پکارا جاتا ہے۔ پانچویں صدی ہجری کے مشہور حنفی فقیہ ہیں۔

٤۰- حموی:

ابو العباس، احمد بن محمد، حموی مصری متوفی ۱۰۹۸ھ۔ علاّمہ حسن بن عمار شرنبلالی کے شاگرد ہیں۔ "غمز عیون البصائر" کے نام سے "الأشباہ و النظائر" کی مشہور شرح لکھی ہے۔ کثیر التصانیف ہیں۔ "کنز" کی "شرح ملاّ مسکین" کا حاشیہ بھی آپ سے یادگار ہے۔

٤۱- خبازی:

دیکھیے: خجندی

٤۲- خجندی:

جلال الدین عمر بن محمد خبازی خجندی، مشاہیر احناف میں سے ہیں۔ ان کے بارے میں کہا گیا ہے: "کان عالما، زاهدا، متنسکا، جامعاً للفروع و الأصول" ان کی سند

یہ ہے:"عن علاء الدین عبد العزیزعن فخر الدین محمد عن شمس الائمة محمد بن عبد الستار الکردری عن صاحب الهدایه." "المغنی فی الأصول" آپ کی تصنیف ہے۔"هدایه" کا حاشیہ بھی لکھا جس کو آپ کے شاگرد احمد بن مسعود قونوی نے مکمل کیا۔ ٧٦١ھ میں فوت ہوئے۔

٤٣- خصاف:

ابو بکر احمد بن عمر شیبانی متوفی ٢٦١ھ۔ آپ ریاضی اور فقہ حنفی کے بہت بڑے عالم تھے۔ قاضی خان فرماتے ہیں:"والخصاف کان کبیرا فی العلم یجوز الاقتداء به" "کتاب الشروط و النفقات"، "کتاب الحیل"، "أحکام الأوقاف" اور "أدب القاضی" آپ کی یادگار ہیں۔ خصاف: موچی۔

٤٤- خواہرزادہ:

شیخ الاسلام ابوبکر محمد حسین بن محمد بخاری، پانچویں صدی کے بڑے فقیہ ہیں۔ ماوراء النہر میں حنفیہ کے امام تھے۔ خواہرزادہ فارسی میں بھانجے کو کہتے ہیں، قاضی ابو ثابت محمد بن احمد بخاری کے بھانجے تھے، اس لئے خواہرزادہ سے شہرت ہوئی۔ آپ کی کتابوں میں "مبسوط"، "مختصر" اور "تجنیس" شامل ہیں۔ ٤٨٣ھ میں انتقال کیا۔

٤٥- خیر رملی:

خیر الدین بن احمد بن علی ایوبی، علیمی، فاروقی، رملی۔ فلسطین کے مشہور علاقے رملہ کے رہنے والے تھے۔ "فتاوی خیریه" آپ ہی کے فتاوی کا مجموعہ ہے۔ آپ کے صاحب زادے محی الدین بن خیر الدین متوفی ١٠٧١ھ نے اس کو جمع کرنا شروع کیا تھا، مگر مکمل ہونے سے پہلے وفات پا گئے تو شیخ ابراھیم بن سلیمان جینینی متوفی ١١٠٨ھ نے اس کو مکمل کیا۔ "تنویر الأبصار" کی جو شرح خود ماتن نے "منح الغفار" کے نام سے لکھی، اس پر آپ نے حاشیہ لکھا ہے۔ "الأشباه و النظائر" اور

"جامع الفصولین" پر بھی آپ کے حواشی ہیں۔"البحر الرائق" پر بھی "مظھر الحقائق" کے نام سے آپ نے حاشیہ لکھا ہے جس سے علامہ شامی "البحر الرائق" پر اپنے حاشیے "منحۃ الخالق" میں کثرت سے حوالے دیتے ہیں۔آپ کی پیدائش ۹۹۳ھ اور وفات ۱۰۸۱ھ میں ہوئی۔

٤٦- الدامغانی:

ابو عبداللہ محمد بن علی دامغانی متوفی ٤٨٧ھ۔عراق میں حنفیہ کی ریاست آپ پر ختم تھی۔ "مختصر حاکم" کی شرح لکھی ہے۔

٤٧- رازی:

حسام الدین رازی، دیکھیے: حسام الدین۔

٤٨- رازی:

ہشام بن عبد اللہ رازی، فقیہ ہونے کے علاوہ ثقہ محدث بھی تھے۔امام مالک سے روایت کی ہے۔"صلاۃ الأثر" اور "کتاب النوادر" آپ کی تصنیفات ہیں۔صاحبین کے خاص شاگرد تھے۔''رے'' میں آپ ہی کے مکان میں امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا تھا۔ ۲۰۱ھ میں فوت ہوئے۔

٤٩- رحمتی:

الشیخ مصطفیٰ بن محمد بن محمد رحمۃ اللہ انصاری دمشقی المعروف بہ رحمتی۔یہ ایک واسطے سے علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ ہیں۔انہوں نے "الدر المختار" پر حاشیہ لکھا جس سے علامہ شامی گاہے گاہے استفادہ کرتے ہیں۔

٥٠- رکن الائمہ صباغی:

ابو المکارم عبد الکریم بن محمد صبّاغی، "مختصر قدوری" کے شارح ہیں۔

۵۱- رملی:

دیکھیے: خیر رملی

۵۲- زاھدی:

ابو الرجاء، نجم الدین، مختار بن محمود زاہدی، ساتویں صدی کے مشہور حنفی فقیہ تھے۔ كان من كبار الأئمة وأعيان الفقهاء، عالما كاملا، له اليد الباسط فى الخلاف والمذهب، والباع الطويل فى الكلام والمناظرة. "قدوری" کی نفیس شرح "مجتبیٰ" کے نام سے لکھی ہے۔ "قنية" بھی آپ کی تصنیف ہے۔ پورا نام "قنية المنية لتتميم الغنية" ہے، یہ آپ کے استاذ بدیع بن منصور کی "منية الفقهاء" کا خلاصة ہے۔ اپنے وقت کے بہت بڑے امام اور فقیہ تھے۔ عقیدۃً معتزلی تھے، اس لئے جب تک دوسری کتابوں سے انکی باتوں کی مطابقت نہ ہو جائے ان کی سب روایتیں معتبر نہیں۔ ۶۵۸ھ میں وفات پائی۔

۵۳- زفر بن ہذیل:

تمیمی بصری، امام صاحب کے جلیل القدر شاگرد ہیں۔ امام صاحب آپ کی تعظیم کرتے تھے اور فرماتے تھے: "هو أقيس أصحابى" ان کا نکاح بھی خود پڑھایا، خطبہ میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے: "هذا زفر بن هذيل، إمام من أئمة المسلمين وعلم من أعلامهم فى شرفه وحسبه وعلمه". فقہ حنفی کے سترہ مسائل میں آپ کے قول پر فتوی ہے۔ ۱۵۸ھ میں عین عالم شباب میں بعمر اڑتالیس سال انتقال فرمایا۔

۵۴- زوزنی:

تاج الدین محمد بن محمود سدیدی متوفی ۶۹۹ھ۔ قاضی خان کی "منتخب الزيادات" پر شرح لکھی ہے۔ اس کے علاوہ "ملتقى البحار فى منتقى الأخبار" تحریر کی۔

۵۵- زیلعی:

فخر الدین ابو محمد عثمان بن علی، کبار فقہاء میں سے ہیں۔"کنز الدقائق" کی مفصل و یادگار شرح "تبیین الحقائق" کے نام سے لکھی ہے جو "کنز" کی اہم ترین شروح میں سے شمار ہوتی ہے۔ ۷۴۳ھ میں اس دار فانی سے کوچ کیا۔ یہ "نصب الرایہ" کے مصنف جمال الدین زیلعی کے علاوہ ہیں۔

۵۶- سرخسی:

شمس الائمہ ابو بکر محمد بن احمد سرخسی متوفی ۴۹۰ھ۔ شمس الائمہ حلوانی کے شاگرد رشید ہیں۔ آپ کی مشہور کتاب "مبسوط" تیس جلدوں میں ہے جو آپ نے کنویں میں بحالت قید املا کروائی۔ اس کے علاوہ "سیر کبیر" کی شرح، "اصول سرخسی"، "نکت شرح زیادات الزیادات"، "جامع صغیر و کبیر" اور "مختصر الطحاوی" کی شرح آپ کی یادگار ہیں۔

۵۷- سرخسی:

رياض الدین محمد بن محمد سرخسی متوفی ۵۷۱ھ۔ چھٹی صدی کے مشہور حنفی فقیہ ہیں۔ "محیط" نامی ضخیم کتاب کے مصنف ہیں جو "المحیط الرضوی" اور "المحیط السرخسی" کہلاتی ہے۔ محیط کا معنی احاطہ کرنے والی، چونکہ یہ اصول، نوادر اور نوازل تینوں قسم کے مسائل کا احاطہ کرتی ہے اس لئے "محیط" نام رکھا ہے۔ حنفیہ کی ایک اور محیط، "محیط برھانی" بھی ہے۔

۵۸- سروجی:

قاضی القضاۃ احمد بن ابراہیم، کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ "ھدایہ" کی شرح "غایۃ" اور "فتاوی سراجیہ" مشہور ہیں۔ ۷۱۰ھ میں رحلت فرمائی۔

۵۹- سعدی:

محقق فاضل علامہ سعد اللہ بن عیسی بن امیر خان المعروف بہ سعدی چلپی و سعدی آفندی

متوفی ٩٤٥ھ۔ "هدايه" پر علامہ اکمل الدین بابرتی کی شرح "عنايه" پر "حواشی سعدیه" کے نام سے حاشیہ لکھا ہے جو باوجود اختصار کے تحقیق اور نکتہ آفرینی میں اپنی مثال آپ ہے۔ سلطنت عثمانیہ کے لشکر کے قاضی تھے۔

٦٠- السید الشریف:

علی بن محمد جرجانی۔ کئی مقبول، متداول اور کثیر النفع کتب کے مصنف ہیں۔ علم میراث کی مشہور کتاب "سراجی" کی شرح "شریفیه" اور "التعريفات" سے علامہ شامی نے استفادہ کیا ہے، اس حوالے سے آپ کا اسم گرامی "رد المحتار" میں آیا ہے۔

٦١- شرنبلالی:

حسن بن عمار بن علی، گیارہویں صدی کے مشہور حنفی عالم اور کثیر التصانیف مصنف ہیں۔ آپ کی کتابوں میں سے چند یہ ہیں: "نور الإيضاح" اور اس کی شرح "إمداد الفتاح"، "غنية ذوی الحكام فی بغية درر الأحكام"، "منظومة ابن وهبان" کی شرح اس کے علاوہ "التحقيقات القدسيه" لکھی جو ٤٨ فقہی رسائل کا مجموعہ ہے اور "رسائل شرنبلالی" سے پکارا جاتا ہے۔

٦٢- شلبی:

شہاب الدین احمد بن یونس حنفی، مصری متوفی ١٠٢١ھ۔ آپ کے فتاوی کا مجموعہ آپ کے پوتے نور الدین علی بن محمد متوفی ١٠١٠ھ نے جمع کیا ہے۔ یہ مجموعہ "كنز" کے ابواب کی ترتیب پر ہے۔ "تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق" پر آپ کا حاشیہ مشہور ہے۔

٦٣- شمنی:

تقی الدین احمد بن محمد متوفی ٨٢١ھ۔ "نقايه" کی شرح آپ نے لکھی ہے جس کا علامہ شامی اکثر حوالہ دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ "مغنی اللبيب" کا حاشیہ لکھا ہے۔

٦٤- صالح جینینی:

شیخ صالح بن ابراھیم جینینی حنفی متوفی ١١٧١ھ۔ بارھویں صدی کے مشہور حنفی عالم ہیں۔ جینین فلسطین میں ایک جگہ کا نام ہے اس کی طرف منسوب ہیں۔ فقیہ ہونے کے علاوہ بڑے محدث بھی تھے، شارحِ "أشباہ" علامہ بعلی کے استاد ہیں۔

٦٥- صدرالاسلام بزدوی:

ابوالیسر محمد بن محمد البزدوی متوفی ٤٩٣ھ۔ بزدہ کی طرف نسبت ہے جونسف کے قریب ایک قلعہ ہے۔ حنفیہ کے کبار مشائخ میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ ان کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے: "کان إمام الأئمة علی الإطلاق، ملأ بتصانیفه بطون الأوراق". فخرالاسلام علی بن محمد بزدوی کے بڑے بھائی ہیں۔ دونوں بھائیوں کا سبق اور قلم متضاد صفات کا حامل تھا۔ بڑے بھائی کا انداز بیان سہل اور واضح تھا اور چھوٹے کا دقیق، اس لئے بڑے ابوالیسر اور چھوٹے ابوالعسر کہلاتے ہیں۔

٦٦- صدرالشریعۃ الأصغر:

عبیداللہ بن مسعود محبوبی، مشہور مصنف ہیں۔ "تنقیح الأصول"، "شرح وقایه" اور "وقایه" کی تلخیص واختصار "النقایه" کےعلاوہ علم معانی میں "الوشاح" آپ سے یادگار ہیں۔ ٧٤٧ھ میں وفات پائی۔ آپ کے دادا تاج الشریعۃ محمود بن احمد نے آپ کے حفظ کیلئے "ھدایه" کے مسائل کا خلاصہ "وقایة الروایة فی مسائل الھدایة" لکھا۔ آپ نے نہ صرف اسے حفظ کیا بلکہ اس کی شرح اور اختصار بھی کیا۔

٦٧- صدرالشریعۃ الأکبر:

احمد بن عبیداللہ محبوبی۔ "تلقیح العقول فی الفروق" کے مصنف ہیں۔ اس خاندان کا نسب حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے، حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کے پوتے کا نام محبوب تھا، محبوبی کی طرف نسبت ہے۔

۶۸- صدرالشہید:

ابومحمد حسام الدین عمر بن عبدالعزیز برہان الائمہ۔ کئی اہم کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے "شرح جامع صغیر"، امام خصاف کی "أدب القاضی" کی شرح اور "عمدة المفتی و المستفتی" قابل ذکر ہیں۔ ۵۳۶ھ میں ایک عوامی شورش میں سمرقند میں بحالت سجدہ شہید کئے گئے۔

۶۹- صفار:

ابو القاسم احمد بن عصمة، بلخ کے رہنے والے اور حنفیہ کے بہت بڑے امام ہیں۔ ۳۳۶ھ میں انتقال کیا۔

۷۰- طحاوی:

امام جلیل ابوجعفر احمد بن محمد بن سلامۃ ازدی متوفی ۳۲۱ھ۔ فقہ اور حدیث کے امام ہیں۔ مصر کے "طحا" مقام میں پیدا ہوئے۔ امام مزنی تلمیذ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد اور بھانجے ہیں۔ "بیان مشکل الآثار شرح معانی الآثار" (طحاوی شریف)، عقائد میں "العقيدة الطحاوية" اور فقہ میں متن بنام "مختصر الطحاوی" آپ سے یادگار ہیں۔

۷۱- طحطاوی:

قاضی احمد بن محمد طحطاوی مصری متوفی ۱۲۳۱ھ۔ علامہ شامی کے استاذ اور نافع ومقبول کتابوں کے مصنف ہیں۔ جن میں دو یہ ہیں: "طحطاوی حاشية الدر المختار" اور "طحطاوی حاشية مراقی الفلاح".

۷۲- طرسوسی:

نجم الدین ابراہیم بن علی بغدادی متوفی ۷۵۸ھ۔ آٹھویں صدی کے مشہور حنفی فقیہ ہیں۔ کل عمر ۳۸ سال پائی بایں ہمہ اپنے وقت کے قاضی القضاۃ اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ فقہ

میں ”أنفع الوسائل إلی تحریر المسائل “لکھی جو فتاوی ”طرسوسیه“ کے نام سے معروف ہے۔ دوسری مشہور کتاب ”وفیات الأعیان من مذهب أبی حنیفة النعمان“ ہے۔ اس میں فقہائے احناف کے تراجم لکھے ہیں۔ یہ ابھی تک مخطوطہ ہے۔

۷۳- ظہیرالدین:

محمد بن احمد بخاری متوفی ۲۱۹ھ۔ ”فوائد“ اور ”فتاوی ظهیریه“ کے مصنف ہیں۔ اپنے وقت میں احناف کے امام مانے جاتے تھے۔

تنبیہ:

ظہیرالدین ”فتاوی ولوالجیه“ کے مصنف ابوالفتح عبدالرشید بن ابی حنفیہ ولوالجی بدخشانی متوفی ۵٤٠ھ کا لقب بھی ہے فلیحفظ۔ ولوالج بدخشان کا ایک قصبہ ہے۔

۷٤- عتابی:

احمد بن محمد عتابی متوفی ۵۸٠ھ۔ چھٹی صدی ہجری کے مشہور حنفی فقیہ ہیں۔ بخاریٰ کے ایک محلّہ عتابیہ کی طرف نسبت ہے۔ ”زیادات“ اور ”جامع کبیر“ کی شرح نیز ”فتاوی عتابیه“ اور ”جوامع الفقه“ آپ کی تصنیفات ہیں۔

۷۵- عمادی:

عبدالرحمٰن بن محمد عمادالدین بن محمد العمادی الحنفی متوفی ۱٠۵۱ھ۔ شام کے مفتی تھے۔ یہ کتابیں یادگار چھوڑی ہیں: ”تحریر التأویل علی مافی معانی بعض آی التنزیل“، ”کتاب الهدایه فی العبارات الفقهیه“، ”مقدمة الصلوة“، ”المستطاع من الزاد“.

۷٦- عینی:

بدرالدین، محمود بن احمد۔ مشہور حنفی فقیہ، محدث اور مصنف ہیں۔ ”بخاری شریف“ کی شرح بنام ”عمدة القاری“، ”هدایه“ کی شرح بنام ”بنایة“ اور ”کنز الدقائق“ کی شرح بنام

"رمز الحقائق" لکھی۔تینوں شروحات عینی کے نام سے معروف ہیں۔عینی شرح بخاری،عینی شرح"هدایه" اورعینی شرح کنز۔"درر البحار الذاخرة " اور"الدرر الفاخرة "بھی آپ کی تصانیف ہیں۔٨٥٥ھ میں وفات پائی۔

٧٧- غزنوی:

ابوالمعالی عبدالرب المنصور متوفی ٥٠٠ھ۔"مختصر قدوری" کی شرح لکھی ہے۔

٧٨- فخر الاسلام:

علی بن محمد بزدوی متوفی ٤٨٢ھ۔پانچویں صدی کے مشہور اصولی اورفقیہ ہیں۔"اصول بزدوی" اور"مبسوط"آپ کی تصنیفات ہیں۔اصول بزدوی کا اصل نام"كنز الأصول" ہے۔اپنی دقیق عبارت کی بناء پرابوالعسر کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔

٧٩- فضلی:

ابوبکر،محمد بن الفضل،متوفی ٣٨١ھ۔حنفیہ کے امام ہیں اور دور دراز سے علماء آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔فتاوی کی کتب آپ کے فتاوی سے بھری پڑی ہیں۔

٨٠- فضلی:

عثمان بن ابراھیم اسدی المعروف بفضلی متوفی٥٠٨ھ۔"فتاوی فضلی" کے مؤلف ہیں۔

٨١- قاسم بن قطلو بغا:

مصر،قاہرہ میں ولادت ووفات ہوئی۔نویں صدی کے مشہور حنفی فقیہ اور بڑے محدث ہیں۔شارح"هدایه" علامہ ابن الہمام کے خاص شاگرد ہیں۔بہت سی مفید تصنیفات لکھیں،چند یہ ہیں:"اتحاف الأحياء"، "الترجيح والتصحيح على القدوری"، "تاج التراجم فی طبقات الحنفية"، "موجبات الأحكام وواقعات الأيام". سن وفات ٨٧٩ھ ہے۔

٨٢- قاضی خان:

فخر الدین حسن بن منصور اوزجندی۔"اوزجند"فرغانہ کے قریب ایک جگہ کا نام ہے۔ حنیفہ کے تاج کا چمکتا موتی ہیں۔"فتاوی قاضي خان المعروف بخانية "آپ کی مشہور کتاب ہے،اس کے علاوہ"أمالي" ، "شرح زیادات"، "شرح جامع صغير" اورامام خصاف کی "أدب القاضي" کی شرح آپ سے یادگار ہیں۔کمال پاشانے ان کا شمار مجتھدین فی المسائل میں کیا ہے۔علامہ قاسم بن قطلوبغانے"تصحيح القدوري" میں فرمایا ہے:"ما يصححه قاضي خان مقدم على تصحيح غيره؛ لأنه فقيه النفس." ۵۹۲ھ میں رحلت فرمائی۔

٨٣- قہستانی:

فارسی لفظ"کوہستان" کا معرب،قاف اور ھاء کے ضمہ کے ساتھ،عجم قاف کا ضمہ اور ھا کا کسرہ پڑھتے ہیں۔شمس الدین محمد بن حسام الدین متوفی ۹۵۳ھ۔بخاریٰ کے مفتی تھے۔آپ نے"وقاية" کی تلخیص"نقاية" کی شرح"جامع الرموز" کے نام سے لکھی ہے۔اس شرح کے بارے میں مشہور ہے کہ اس میں رطب ویابس اقوال جمع ہیں لہٰذا جب تک دوسری کتابوں سے اس میں منقول روایات کی تائید نہ ہوں،یہ روایتیں معتبر نہیں۔لیکن یہ بات روایات کی صحت کی حد تک ہے۔جہاں تک فوائد ونکات فقیہ کا تعلق ہے تو وہ انتہائی نفیس ہے۔

٨٤- قونوی:

شمس الدین محمد بن یوسف قونوی،افاضل حنفیہ میں سے تھے۔"درر البحار" اور "مجمع البحرين" کی شرح لکھی ہے۔۷۸۸ھ میں فوت ہوئے۔

٨٥- کرخی:

عبید اللہ بن حسین کرخی متوفی ۳۴۰ھ۔امام بردعی،قدوری اور خصاف جیسے اعلام کے شاگرد اور امام طحاوی وجصاص کے معاصر ہیں۔"جامع صغير" اور"جامع كبير" کی شروحات

تصنیف کی ہیں۔اس کے علاوہ ''اصول کرخی'' کے نام سے آپ کی ایک یادگار تصنیف موجود ہے جس میں وہ اصول بیان کئے گئے ہیں جن پر فقہ حنفی کی جزئیات کا مدار ہے۔ ولادت کرخ میں اور وفات بغداد میں ہوئی۔

٨٦- کردری:

شمس الائمۃ، محمد بن عبد الستار کردری متوفی ٦٤٢ھ۔ ساتویں صدی کے مشہور حنفی فقیہ ہیں۔ ''قاضی خان'' اور صاحب ''ھدایہ'' شمس الائمہ بکر بن محمد زرنجری اور صاحب ''شرعۃ الإسلام'' امام زادہ کے شاگرد ہیں۔ اور حمید الدین ضری، حافظ الدین بخاری اور خواہر زادہ محمد بن محمود کے استاذ ہیں۔ تصنیفات یہ ہیں: ''مختصر'' علم الفقہ میں اور ''الرد و الانتصار'' علم کلام میں، یہ امام غزالی کی ''المنخول'' پر ردّ ہے۔

٨٧- کمال ابن الھمام:

کمال الدین، محمد بن عبد الواحد سیواسی اسکندری متوفی ٨٦١ھ۔ ہمام کے معنی سخی سردار کے ہیں۔ علوم عقلیہ ونقلیہ کے جامع اور مجتہد تھے۔ مصر کے مشہور شہر اسکندریہ میں پیدا ہوئے۔ اعلیٰ پائے کی مفید اور مشہور کتابوں کے مصنف ہیں، چند یہ ہیں: (١) ہدایہ کی شہرۂ آفاق شرح ''فتح القدیر للعاجز الفقیر'' کتاب الوکالۃ کی ''فصل: الوکلاء علی ضربین'' تک لکھ پائے تھے کہ انتقال فرما گئے۔ شمس الدین احمد بن قودر المعروف بہ قاضی زادہ نے تکملہ لکھا۔ علامہ ابن الھمام نے قاری الھدایہ علامہ سراج الدین عمر بن علی کتانی متوفی ٨٢٩ھ سے انیس سال تک ''ھدایہ'' تحقیق واتقان کے ساتھ پڑھی ہے۔ پھر استاذ کے بعد پڑھانا شروع کی اور ساتھ ہی شرح بھی لکھنی شروع کی۔ (٢) اصول فقہ میں ''التحریر بین اصولی الشافعیۃ و الحنفیۃ'' (٣) عقائد میں ''المسایرۃ فی العقائد المنجئۃ فی الآخرۃ'' مسایرۃ کے معنی ہیں ساتھ ساتھ چلنا، اس کتاب میں امام غزالی کے رسالہ ''قدسیہ'' کی ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے اس لئے مسایرہ کے نام سے موسوم کیا۔ کمال الدین محمد بن محمد شافعی متوفی ٩٠٥ھ نے ''مسامرۃ'' کے نام سے

اس کی شرح لکھی ہے۔(٤)"زاد الفقیر" یہ مسائل فقہیہ کا مجموعہ ہے جوایک سفر کے دوران تصنیف فرمایا۔سیواس آبائی وطن ہے،جوترکی میں ہے۔

۸۸- لؤلؤی:

حسن بن زیاد لؤلؤی، امام صاحب کے شاگرد رشید ہیں۔آپ کے والد موتیوں کے تاجر تھےاس لئے لؤلؤی کہلائے۔حنفیہ کے ائمہ میں امام زفر بن ہذیل کے بعدآپ کا مرتبہ ہے بلکہ بعض حضرات نے آپ کوامام زفرکا ہم رتبہ قرار دیا ہے۔تصنیفات یہ ہیں:"کتاب المقالات"، "کتاب المجرد"، "کتاب الأمالی"، "أدب القاضی"، "الفرائض و الوصایا". کوفہ کے قاضی رہےاور ٢٩٤ھ میں وفات پائی۔

۸۹- محبوبی:

تاج الشریعۃ محمود بن احمد بن عبیداللہ بخاری۔فقہ کے متن"وقایہ" کے مصنف ہیں جو اپنے پوتے صدرالشریعۃ عبیداللہ بن مسعود کے حفظ کیلئے "ھدایہ" سے اختصار کر کے لکھا تھا۔

اس خاندان کا سلسلہ نسب حضرت عبادہ بن صامت انصاری رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے۔حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کے پوتے کا نام محبوب تھا،محبوبی ان کی طرف نسبت ہے۔

۹۰- محمد بن حسن شیبانی:

امام صاحب کے تلمیذ خاص،ان کے علوم کے امین، جامع اور ناشر ہیں۔امام صاحب کی وفات کے بعدامام ابویوسف سے علوم کی تکمیل کی۔فقہ کے علاوہ عربیت اورنحو کے بھی امام تھے۔فقہ حنفی کی"امہات ستہ" آپ کے نوک قلم سے نکلی ہوئی شاہکار ہیں۔ان کتب ستہ کے علاوہ"کتاب الحجة علی أهل المدینة"، "مؤطا إمام محمد" اور"کتاب الأمالی"بھی آپ کی یادگار ہیں۔

۹۱- محمد بن سلمہ:

ابوعبداللہ محمد بن سلمہ بلخی متوفی ۲۷۸ھ۔مشہور حنفی فقیہ ہیں۔پہلے شداد بن حکیم سے پڑھا

جو امام زفر کے شاگرد ہیں، پھر ابو سلیمان جوزجانی تلمیذ امام اعظم کی شاگردی اختیار کی۔ بلخ کے امام مانے جاتے تھے۔

٩٢- محمد بن مقاتل:

امام محمد کے شاگردوں میں سے ہیں۔ "كتاب المدعى والمدعى عليه" آپ کی تصنیف ہے۔ سن وفات ٢٤٢ھ۔

٩٤- فرغانی:

ابوالحسن برہان الدین، علی بن ابی بکر فرغانی، ائمہ فقہاء میں سے ہیں۔ کئی مشہور تصنیفات رقم کیں، جیسے "هدايه"، "تجنيس"، "المزيد"، "مختارات النوازل"، "منتقى الفروع"، "كتاب الفرائض"، "كفاية المنتهى" اور "مناسك الحج". وفات ٥٩٣ھ میں ہوئی۔ مزید دیکھیے: ہدایہ۔

٩٥- مطرزی:

ناصر الدین بن عبد السید، فقہ کے علاوہ لغت کے بھی امام تھے۔ "مُغرب" نامی مشہور فقہی لغت آپ ہی کی تصنیف ہے۔ وفات ٦١٠ھ میں ہوئی۔

٩٦- مقدسی:

علی بن محمد المعروف بابن غانم المقدسی، حنفی فقیہ ہیں، ١٠٠٤ھ میں فوت ہوئے۔ آپ نے "كنز الدقائق" کی منظوم شرح لکھی ہے جس کا نام "أوضح الرمز على نظم الكنز" ہے۔ شامیہ میں اس کا بکثرت حوالہ ملتا ہے۔

٩٧- منلا خسرو:

محمد بن فراموز المعروف بہ ملا خسرو "غرر الأحكام" کے نام سے متن لکھا پھر "درر الحكام" کے نام سے اس کی شرح لکھی جو دو جلدوں میں ہے۔ "مرقاة الاصول" بھی آپ کی

کتاب ہے۔ ۸۸۵ھ میں فوت ہوئے۔ منلا کے نون کا لام سے ابدال اور اس میں ادغام کر کے ''ملاّ'' بھی کہتے ہیں۔ ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی علامہ کے ہیں۔

۹۸- ملاّ مسکین:

معین الدین ہروی المعروف بہ ملا مسکین متوفی ۹۵٤ھ۔ ''کنز'' کی شرح لکھی ہے جو ''شرح ملا مسکین'' کے نام سے معروف ہے۔ علامہ حموی نے اس کا حاشیہ ''فتح المعین علی شرح ملا مسکین'' کے نام سے لکھا ہے۔

۹۹- موصلی:

ابراہیم بن عبدالکریم موصلی متوفی ٦٢٨ھ ''قدوری'' کے شارح ہیں۔

۱۰۰- نابلسی:

اسماعیل بن عبدالغنی نابلسی فلسطینی متوفی ۱۰٦۲ھ۔ ''الدرر'' کی شرح بارہ جلدوں میں لکھی ہے جس کا نام ''الاحکام'' ہے۔ آپ کے والد شیخ عبدالغنی نابلسی بھی مشہور فقیہ اور کثیر التصانیف صاحب قلم ہیں۔

۱۰۱- ناطفی:

ابوالعباس احمد بن محمد ناطفی متوفی ٤٤٦ھ۔ ''رے'' کے رہنے والے تھے۔ آپ نے ابوعبد اللہ جرجانی سے پڑھا ہے، جو امام جصاص رازی کے شاگرد ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں، چند یہ ہیں: ''اجناس''، ''فروق''، ''احکام'' الصدر الشہید حسام الدین عمر بن عبدالعزیز نے ''واقعات حسامیہ'' میں فقیہ ابواللیث کی ''کتاب النوازل'' اور آپ کی ''مجموع النوازل والواقعات'' کو جمع کیا ہے۔ ناطف کے معنی ہیں ریوڑی جو ایک قسم کی مٹھائی ہے۔ ناطفی: ریوڑی بنانے یا بیچنے والا۔

۱۰۲- نجم الائمہ:

استاد فخر الدین قزوینی بخاری، ایک نجم الائمہ حکیمی ہیں جو قاضی خان کے شاگرد اور رکن الائمہ ولوالجی کے استاد ہیں۔ وفات بخارا میں ہوئی۔

١٠٣- هندوانی:

فقیہ ابو جعفر محمد بن عبد اللہ بلخی هندوانی، حنفیہ کے جلیل القدر امام ہیں۔ "أبـو حـنـيـفـة الصغير" کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔ چار واسطوں سے امام محمد کے شاگرد اور فقیہ ابو اللیث سمرقندی کے استاد ہیں۔ ہندواں، افغانستان کے صوبہ مزار شریف کے صدر مقام بلخ کا ایک محلّہ ہے۔اس کی طرف منسوب ہیں۔ ٦٢ سال کی عمر میں ٣٦٢ھ میں انتقال فرمایا۔

١٠٤- ولوالجی:

ظہیر الدین، عبد الرشید بن ابی حنیفہ ولوالجی بدخشانی متوفی ٥٤٠ھ۔ "فتاوى ولو الجية" کے نام سے آپ کے فتاویٰ مشہور ہیں۔ ولوالج افغانستان کے صوبہ بدخشان کا ایک قصبہ ہے۔

مراجع ومصادر

نمبر شمار	نامِ کتاب	مصنف...... مطبع وسن طباعت
۱	الاتقان	جلال الدین عبدالرحمٰن السیوطی، سہیل اکیڈمی، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور، ۱۳۹۴ھ
۲	ادب المفتی والمستفتی	تقی الدین عثمان بن صلاح الدین المعروف بابن صلاح، دار المعرفۃ، بیروت، ۱۴۰۶ھ
۳	اعلام الموقعین	محمد بن ابی بکر الجوزی المعروف بابن القیم، دار الجیل، بیروت
٤	امداد الفتاوی	حکیم الامت شاہ محمد اشرف علی تھانوی، مکتبہ دار العلوم کراچی
۵	البلاغ، مفتی اعظم نمبر	مفتی محمد تقی عثمانی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱٤۲٦ھ
٦	بلوغ الامانی فی سیرۃ الامام محمد بن الحسن الشیبانی	علامہ محمد زاہد الکوثری، ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی
۷	تاریخ دعوت وعزیمت	سید ابوالحسن علی الندوی، مجلس نشریات اسلام، ناظم آباد، کراچی
۸	تحفۃ العلماء	حکیم الامت شاہ محمد اشرف علی تھانوی، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان، ۱٤۱۵ھ
۹	تفسیر ابن کثیر	الحافظ عماد الدین اسماعیل بن کثیر الدمشقی، مکتبہ دار المعرفۃ، بیروت، ۱٤۱۷ھ
۱۰	تفسیر طبری	امام ابوجعفر محمد بن جریر الطبری، دار الاعلام، عمان، ۱٤۲۳ھ
۱۱	تھذیب التھذیب	الحافظ احمد بن علی بن حجر العسقلانی، المکتبۃ التجاریہ، مصطفیٰ احمد الباز، ۱٤۱۵ھ
۱۲	جدید فقہی مباحث	مولانا مجاہد الاسلام قاسمی، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، کراچی نمبر ۵

۱۳	حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار	سید احمد الطحطاوی، المکتبۃ العربیہ، کانسی روڈ کوئٹہ
۱٤	کتاب الحیل	امام احمد بن عمر الخصاف
۱۵	رد المحتار علی الدر المختار	علامہ محمد امین بن عمر بن عابدین شامی، ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی
۱٦	شرح عقود رسم المفتی	علامہ محمد امین بن عمر بن عابدین شامی، کتاب گھر، ناظم آباد
۱۷	فتاوی ابن صلاح	تقی الدین عثمان بن صلاح الدین، دار المعرفۃ، بیروت، ١٤٠٦ھ
۱۸	فتح الباری شرح صحیح البخاری	الحافظ احمد بن علی بن حجر العسقلانی، المکتبۃ التجاریہ، مصطفیٰ احمد الباز، ١٤١٤ھ
۱۹	قواطع الادلہ	ابو المظفر منصور بن محمد السمعانی، مکتبۃ نزار مصطفیٰ الباز، مکۃ المکرمۃ، ١٤١٨ھ
۲۰	کتاب الآثار	امام محمد بن الحسن الشیبانی، ادارۃ القرآن، کراچی
۲۱	المعجم الاوسط	سلمان بن احمد الطبرانی، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ١٤٢٠ھ
۲۲	مقدمۃ المجموع شرح المہذب	ابو زکریا محی الدین یحیٰ بن شرف النووی، المکتبۃ السلفیۃ، المدینۃ المنورہ
۲۳	مناقب الامام ابی حنیفۃ	امام محمد بن محمد کردری
۲٤	الموافقات	ابو اسحاق ابراہیم بن موسیٰ الشاطبی، مکتبۃ دار المعرفۃ، بیروت، ١٤٢٠ھ
۲۵	نثر المرجان فی رسم نظم القرآن	
۲٦	املائی افادات	حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی قدس سرہ